

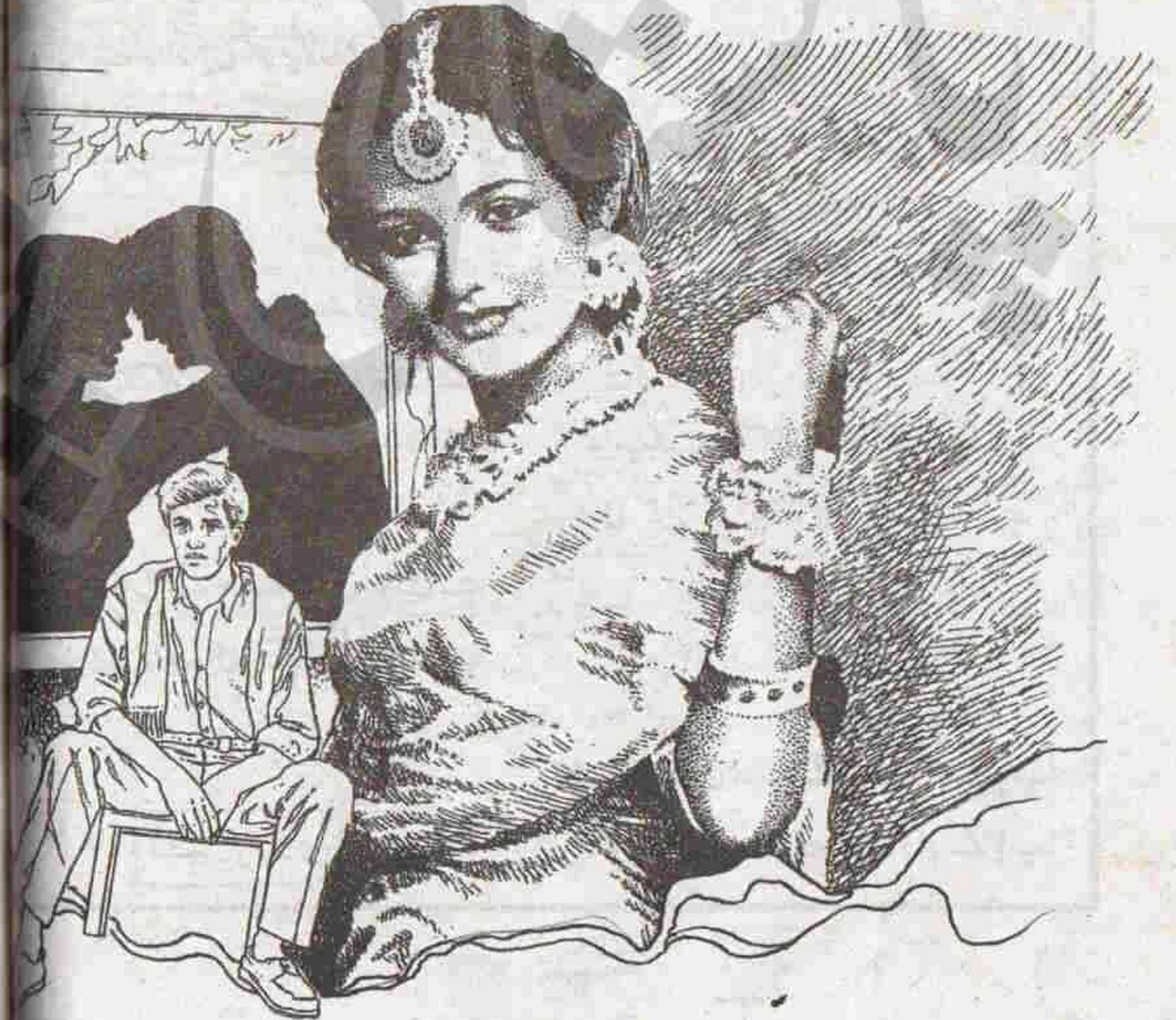
عالیہ حرا

مکمل ناول

چاہتوں کے پرندے

مجھے یقین ہے برف باری کے بعد جو برف پگھلے گی تو سب کچھ گزشتہ گمشدہ، محبتوں کا مدفن ہو جائے گا اور محبت، اعتماد، یقین اور شرعی یقین اور شرعی بندھن میں مجھے ملے گی۔ یہ سب سوچتی وہ دھیرے دھیرے بچوں کا کام چیک کرنے لگی اور پھر.....

چاہتوں کے رنگ لیے ایک خوب صورت مکمل ناول



میں خیال ہے ہم تھک گئے ہیں ابی جان۔“
اس نے پانی کا پائپ ایک سلائیڈ پر گرا کر فل کھلا ہوا
نلکا بند کیا اور لان میں رکھی اسکاٹی بلوچیز پر بیٹھ گئی۔
”ہم میں اور تم.....“ ابی جان نے گھوم کر دیکھا۔
”جی میں اور آپ اور اب چل کر چائے پیتے
ہیں اور کوئی اچھی سی مووی دیکھتے ہیں۔“
”تمہیں معلوم ہے مریم کہ فوجی لوگ تھکتے
نہیں۔“ ابی جان آرام سے کیاری کی زمین ہموار
کرنے میں مصروف تھے۔
”فوجی آپ ہیں، میں تو نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے
اس نے ٹانگیں سامنے ٹیبل سے ٹکالیں۔
”فوجی کا خون، فوجی کی بیٹی، فوجی کی پوتی تو
ہو۔“ انہوں نے ہارمانی تو سیکھی ہی نہیں تھی اور وہ بھی
مریم سے..... امپائل۔

”ابھی یہ سارا جھاڑ جھنکار ٹھکانے لگانا ہے۔“
انہوں نے جھٹ اسے نیا کام بتایا۔
”ایک ماچس کی تیلی دکھا دیں، ابھی ٹھکانے
لگ جائے گا..... یوں۔“ اس نے چنگی بجاتے
ہوئے کہا اور اس عمل پر انہوں نے ایک بار پھر اسے
گھوم کر دیکھا تھا۔
”تاکہ محلے والوں کو پہلے ہفتے ہی شکایت ہو
جائے، ہم لوگوں سے کہ یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا
ہے۔ ہم اس کی کھا دیتا نہیں گے۔“
”ہم۔“ اب وہ اچھل کر سیدھی ہوئی۔ ”کیسے
مگر میں بہت تھک چکی ہوں۔“ اس نے رونی شکل
بناتے ہوئے کہا۔

”Ozone کی تہہ کو ہم جتنا بچا سکتے ہیں بچا
لیں۔ دھواں بہت خطرناک ہے اس تہہ کے لیے
اس جھاڑ جھنکار کو گڑھا کھود کر دبا دیں گے تو کھا د
تیار ہو جائے گی، جو کیاریوں میں کام آئے گی۔“
مریم نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”فوجی کچھ بھی

ضائع نہیں ہونے دیتے۔“ اس نے ان کی بات کاٹی۔
”ابی جان چائے۔“
”فوجی کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتے۔ اپنے
کام میں مگن، بس فوجی جو کام شروع کر دیں وہ پورا
کر کے دم لیتے ہیں۔“ ابی جان اسے پھر سے فوجی
نامہ سنانے لگے۔

”فوجی! ایک آرمی آفیسر۔“ اس کی آنکھ بھر
آئی۔ دھیرے سے سر جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ لیفٹ
رائٹ کرنی آگے آئی۔ رسان سے بازو تھام کر انہیں
اٹھایا وہ اٹھ گئے۔ بازو کے اندر اپنا بازو جمائل کر کے
اس نے اندر لاؤنج کی راہ لی اور وہ ساتھ ساتھ چلتے
آئے۔ اکلوتی ملازمہ چائے ٹیبل پر رکھ کر انہیں
بلانے ہی آرہی تھی۔

”جانتی ہوں، تم ایک دلیر فوجی کا مقابلہ نہیں کر
سکتیں۔“ ابی جان پھر شروع ہوئے۔
”نہیں۔“ اس نے ہاتھ صاف کر کے سمو سہ اٹھا
لیا۔ ”میں تو ایک آرمی آفیسر کے ساتھ چائے پینے
آئی ہوں کیوں ناظمہ؟“ مسکراتے ہوئے اس
نے چائے کا سپ لیا اور ابی جان اس کی چالاکی پر
ہنس دیے۔

آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ کمرہ
قدرے گرم تھا۔ اوائل سردیوں کے دن تھے مگر یہاں
پر شاید موسم کے شروع ہوتے ہی ٹھنڈ پوری جولانی
کے ساتھ پڑنے لگتی تھی۔ یہاں کے موسم کا ناظمہ کو
زیادہ پتا تھا کیونکہ وہ یہاں کی رہائشی جو تھی۔ چند ہی
دنوں میں ناظمہ ان کے لیے بہت اچھی ملازمہ ثابت
ہوئی تھی۔ بلکہ اب تو گھر کا فرد ہی بن گئی تھی۔

ناظمہ چائے ادھر ہی لے آئی تھی۔ ابی جان اپنی
روکنگ چیئر پر بیٹھ گئے۔ مریم نے فلور کٹشن سنبھال
لیے تھے۔ ”ارے پکوڑے، سچ ہلکی ہلکی بھوک کا
احساس ہو رہا تھا۔“ تھینک یو۔ ناظمہ۔“ ناظمہ سر

ہاتے ہوئے ابی جان کو چائے دینے لگی۔

☆.....☆

پچھلے ہفتے یہ لوگ اس بل اسٹیشن پر آئے تھے۔
ایک چھوٹی سی خوب صورت وادی تھی۔ چھوٹی سی
پھاڑی کی سطح پر ان کا کانچ درے اونچائی پر تھا۔
اطراف میں کچھ اور بھی کانچ تھے۔ کچھ میں لوگ
رہائش پذیر تھے، کچھ خالی تھے۔ ابی جان نے اچھے
دنوں میں اپنی پسند اور تھریا بیگم کی خواہش پر یہ بنوایا
تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک یہ ریٹنٹ پر دیا ہوا تھا۔ تاکہ
کوئی قبضہ بھی نہ کر سکے اور حفاظت بھی ہوتی رہے۔
رہنے والوں نے اسے بہت دھیان سے رکھا تھا۔ وہ
کوئی سیاح تھا جو کتاب لکھنے اور سیر و سیاحت کے
لئے آیا تھا۔ یہ ایک خوب صورت لکڑی کا کانچ تھا۔
کانچ کے چاروں طرف گارڈنگ کی گئی تھی۔ ناربل،
لانا، مونگرے اور جینیل کے درخت تھے جن کے
درمیان میں آج کل وہ دونوں کول، مستطیل، محرابی
کیاریاں بنا رہے تھے۔ لان میں جھاڑ جھنکار اور
شکل جھاڑیاں بہت تھیں۔ لان کو کاٹ، چھانٹ اور
امواریت کی ضرورت تھی۔ ابھی صرف کانچ کی
سفائی ہوئی تھی، آرائش باقی تھی۔ یہاں انہوں نے
جانے کب تک رہنا تھا۔ مریم کی شادی تک یا پھر
زندگی کی آخری سانسوں تک۔

فیصل آباد سے یہ لوگ دلگرفتہ اور اداس ہو کر
آئے تھے کیونکہ اولاد جب خود سر، منہ پھٹ، بدلچاظ
اور لاپٹی ہو جائے تو درمیان سے ہٹ جانا ہی بہتر
ہوتا ہے اور کرنل ریٹائرڈ افتخار علی جب سے ریٹائرڈ
زندگی گزار رہے تھے جیسے زنگ خوردہ ہو کر گھر میں
اٹھے تھے۔

کرنل افتخار علی چاہتے تھے کہ ان کی پوتی مریم کی
وادی ان کے کسی پوتے یا نواسے سے ہو۔ مگر تقریباً
سب نے ہی اس کے پروپوزل کو ٹھکرا دیا تھا۔ انہیں

بہو مکمل جہیز کے ساتھ چاہیے تھی۔ خوب صورت بھی
ہو اور مالدار بھی۔ اتنی لالچ اپنی ہی بیٹی کے لیے دیکھ
کر کرنل افتخار علی بیچ و تاب کھیا کر رہ گئے تھے۔
حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یتیم بیٹی کے سر پر ہاتھ
رکھتے کہ بھائی کی نشانی ہے مگر ان کے دل میں جانے
کیسا کینہ اور کدورت تھا۔

مریم ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کی بیٹی
تھی۔ اسے فوج میں جانے کا شوق تھا مگر پہلی آنچ پر
کارگل کے محاذ پر اس نے جام شہادت نوش فرمایا
تھا۔ شہریار کے دکھ میں اس کی بیوی زیادہ نہ جی سکی
جب سے مریم کو کرنل افتخار نے ہی اپنے پاس، اپنے
ساتھ رکھ لیا جب تک ان کی بیگم زندہ رہیں۔
مصروفیات تھوڑی کم تھیں مگر ان کے انتقال کے بعد
ساری ہی ذمہ داری ان کے کندھوں پر آگئی اور اسے
تمام بچوں میں اسپیشل درجہ ملنے لگا تھا۔ اس چیز نے
سب بہوؤں کے دل میں رنجش پیدا کر دی اور اپنے
خوب صورت اسمارٹ اور اچھی نوکری والے بیٹوں
کے لیے انہیں مریم جیسی گندی رنگت والی لڑکی کا رشتہ
قطعی منظور نہیں تھا۔ سب نے اپنے اپنے تئیں
میاؤں کو اس سے بدظن کر دیا تھا۔

مریم کے رشتے کے لیے انہیں ٹوبان سب سے
زیادہ پسند تھا مگر ان سب کی باتوں نے انہیں بری
طرح ہرٹ کر دیا تھا۔ تینوں بیٹوں کی باتیں اگر اتفاقاً
نہ سن لیتے تو خوش نہیںوں کے تمام موسم ان کے ساتھ
تھے۔ چنانچہ اب وہ سب سے بیزار ہو کر اپنے اس
پھاڑی علاقے میں بنے کانچ میں مریم کے ساتھ
آگئے تھے۔

مریم اور وہ یہاں آ کر بہت خوش تھے۔ کچھ
عرصہ کے لیے پریشانیوں سے نجات مل گئی تھی مگر
ایک خیال کرنل افتخار علی کو آنے لگا کہ یہاں تنہا، اس
علاقے میں آ کر انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ مریم

کی شادی کی عمر تھی اور یہاں جنگل بیابان میں لوگ سیاحت اور سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں، چہ جائیکہ رشتے کرنے۔ اپنے دو تین دوستوں کو رابلے کے لیے نمبر تو دے کر آئے تھے کہ کوئی رشہ ہو تو بیانا مگر امکان مشکل تھا۔ چنانچہ دونوں دادا پوتی یہاں مزے میں تھے مگر متفکر تھے۔

یہاں نہ کینہ تو زلفیں تھیں، نہ دل جلانے والی باتیں اور نہ ہی آنے جانے پر نظر رکھنے والے لوگ۔ ناظمہ انہیں مفت میں مل گئی تھی۔ وہ ایک ضرورت مند عورت تھی۔ بچے تھے نہیں، شوہر نے بچوں کی خاطر دوسری شادی کر لی۔ جسکے گئی شیکے میں بھائیوں کا راج، کون قدر کرتا ہے ماں باپ کے بعد۔ پہاڑی کے نیچے کسی گاؤں کی تھی وہ، ارد گرد کے جنگلوں میں کام کرتی تھی۔ روز آنا جانا اس کے لیے مشکل تھا۔ سو ایسے ہی سرسری بات ہو رہی تھی۔ اس کی رہائش کا مسئلہ تھا۔ انہوں نے شریف کام والی عورت دیکھ کر رکھ لیا۔ عورت کی شرافت اس کے چہرے سے پتا چل جاتی ہے۔ مخلص سی ناظمہ کو ایک گھر مل گیا اور انہیں ایک اچھی گھر گرہستی والی عورت۔ دونوں کے کام چل رہے تھے۔

☆.....☆

”ابی جان!“ مریم نے بڑے مصروف سے انداز میں جنگلی شہوت کھاتے ہوئے انہیں پکارا۔ ”ہوں۔“ پرانا اخبار دیکھتے ہوئے انہوں نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔ ”ہمیں یہاں کوئی لائبریری دریافت کر لینا چاہیے۔“

انہوں نے ایک بار پھر اسے عینک کے اوپر سے دیکھا۔ انہیں شاید اس کی دماغی حالت پر شک گزرا تھا۔ اس جنگل بیابان میں جہاں لوگ زیادہ تر سیر و سیاحت کے لیے آتے تھے اور مقامی لوگ اتنے

پڑھے لکھے نہیں تھے، ان کی اپنی ضرورتیں ہی بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ اب کے انہوں نے کچھ کہے بغیر اخبار کے اندرونی صفحات کھولنے شروع کر دیے۔ ”یا پھر ہمیں یہاں کسی لائبریری کی داغ بیل ڈال دینی چاہیے۔“ شہوت پلیٹ میں ختم ہو گئے تھے۔ اس نے پلیٹ گھاس پر رکھ دی۔

”ہمیں یہاں کے لوگوں کے لیے کام اور صرف کام کرنا چاہیے میرا خیال ہے کہ یہاں کوئی اسکول نہیں ہوگا اگر ہوگا تو نیچے وادی میں، بہت دور، کیوں کہ یہاں بچوں کو زیادہ تر میں نے کھیلتے ہی دیکھا ہے۔ کیوں ابی جان؟“ اب وہ ان کی چیر سنبھالے اس پر جھول رہی تھیں۔

”اور آخر ہم یہاں ایسے ہی تو نہیں رہ سکتے۔ یوں بیٹھے بیٹھے تو آپ کی صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے گا۔“ آخری بات کہتے ہوئے وہ زیر لب مسکرائی۔

”ہوں۔“ ابی جان اخبار میں مکمل گم تھے۔

اس کی بات پر آدمی توجہ دی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس لیے دادا کی عدم توجہی کو محسوس نہیں کیا۔ ”اور اگر نہیں تو ہمیں پھر کسی اسکول کی بنیاد یہاں رکھ لینی چاہیے۔ شہر جا کر ہمیں کتابیں، کاپیاں، پمپلین وغیرہ لے آنا چاہیے۔ کالج ہمارا سیٹ ہو گیا ہے۔ لان آہستہ آہستہ ہی سیٹ ہوگا۔ لان کا آدھا کام تو تقریباً ہو ہی چکا ہے۔“ چہار اطراف دیکھ کر اس نے اب عدم توجہی کو محسوس کیا۔ ”ابی جان!“

”ہاں..... ہاں۔ جی ابی کی جان۔“ وہ متوجہ ہوئے تو گود میں رکھا اخبار اور پھر عینک گھاس پر گئی۔ ”کیا بات ہے۔“ اب وہ پوری طرح اس کی جانب گھومے تھے۔ ”کیوں چیخ رہی ہو؟“ بڑے آرام سے کہہ کر انہوں نے پھر سے اخبار اٹھالیا۔ مریم لب

بھیج کر انہیں دیکھنے لگی۔ اخبار اور عینک اٹھا کر انہوں نے اسے دیکھا اور پھر مسکرا دیے۔ ”میں آپ سے نہیں بولتی۔“ سینے پر ہاتھ باندھ کر اس نے خطی سے منہ پھیر لیا۔ سردیوں کی روپوشی دھوپ نے اس کا احاطہ کر لیا اور ابی جان کھلکھلا کر ہنس دیے۔

”میں تمہارے خیال سے سو فیصد بھی متفق نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“ اس نے عینک ابرو سے اٹھیں دیکھا۔ ”اس لیے بچے کہ.....“ وہ سیدھے ہو کر بیٹھے۔ ”ان سارے کاموں کے لیے پیسہ چاہیے۔ کچھ افراد کی شمولیت چاہیے، بچوں کو پڑھانے کے لیے۔ میرے خیال میں یہاں کے لوگ بہت غریب ہیں۔ ان کی بنیادی ضروریات جانے کیسے پوری ہونی ہیں۔“ ”اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں۔“ وہ جذباتی ہو کر سیدھی ہوئی۔ ”تعلیم بنیادی شعور ہے، آگہی ہے۔ آگے بڑھنے کا، ترقی کرنے کا پہلا قدم ہے۔ ہم اور کچھ نہیں تو آگہی تو دے سکتے ہیں ابی جان۔ قطرہ قطرہ کر کے دریا بنتا ہے..... اور..... اور ہمارا وقت کتنا اچھا گزرے گا اور..... آپ تو.....“ اس نے شاکی سے انداز سے انہیں دیکھا۔

”آپ تو فوجی ہیں۔ فوجی بندے کبھی فارغ نہیں بیٹھ سکتے۔“ اس نے انہیں اموشنی بلیک میل کرنا چاہا۔

اب کے اختراع علی ذومعنی انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ”فی الحال ہم ایسا کرتے ہیں۔“ انہوں نے اخبار میز پر رکھ کر عینک اس پر رکھی۔ ”ہم نیچے وادی کا ایک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہاں کچھ کتابیں مل جائیں پڑھنے کے لیے۔ اگر نہیں تو پھر شہر کچھ ہی دور ہے یہاں سے، کل چلیں گے کچھ اور چیزیں بھی لے آئیں گے۔“

گے۔“ اس نے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر رکھا تھا۔
ابی جان اس کی بات سنتے ہوئے اب سگار سلگا
رہے تھے۔

”وہیں میں بیٹھ کر بچوں کو پڑھایا کروں گی۔“
اس کا منظر نامہ تیار تھا۔ ”ٹھیک ہے نا۔“
”ہوں۔“ انھار علی نے ہنکار بھرا۔
”پھر مجھے نیچے وادی میں اپنے ساتھ لے چلیں
گے نا۔“

پگلی یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اکیلے اسے ادھر چھوڑ
کر جانے کا ریسک نہیں لے سکتے تھے۔ مریم انہیں
کتنی عزیز تھی۔ کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔
”پھر میں تیاری کروں۔“ اس کے کہنے پر
انہوں نے سر ہکا کر اسے دیکھا۔

”آج تو نہیں جا رہے۔“
”پھر کب چلیں گے؟“
”کل یا پرسوں۔“ انہوں نے سنجیدگی سے
جواب دیا اور کتاب اٹھالی۔ مریم نے بخور ان کا
جائزہ لیا۔ وہ کچھ سنجیدہ سے لگ رہے تھے۔
”ابی جان۔“ وہ دھیرے سے اٹھی اور ان کے
پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔ طبیعت ٹھیک ہے آپ
کی۔“ کرمل صاحب نے کتاب کے اوپر سے اسے
دیکھا۔

”میری طبیعت کو کیا ہوا؟“
”مجھے لگ رہا ہے۔“ ان کے گھٹنوں پر ہتھیلیاں
رکھ کر اس نے چہرہ نکالیا۔
”کیا۔“

”آپ یہاں آکر اداس ہو گئے ہیں۔“ کرمل
صاحب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ ”کیا آپ کو کھر
والے یاد آتے ہیں۔ ربیعہ، ہمشہرہ، آیان منوچہر۔“ وہ
رک گئی۔ اس نے ثوبان کا نام نہیں لیا تھا۔ ”واپس
چلیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے جوش سے سر ہلایا تو
اس کی پونی ادھر ادھر ہلنے لگی۔ ”کچھ کتابیں کچھ
کاپیاں، کچھ پینسلین۔“ انھار علی نے گہرا سانس لیا۔
”ٹھیک ہے بیٹا مگر یہ مشکل مرحلہ ہے۔ میرا
خیال ہے کہ۔۔۔۔۔“

”ابی جان مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں اور پھر
کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہوتا ہے نا۔“ یک
لخت ہی وہ سنجیدہ ہو گئی۔

ابی جان نے بخور اس کا جائزہ لیا۔ سینے پر ہاتھ
باندھے۔ وہ دائیں جانب دیکھ رہی تھیں۔ اس کے
چہرے پر اچانک ہی سنجیدگی کے بادل اترنے لگے
تھے۔ کرمل انھار علی نے نظریں چرائیں کیونکہ وہ اس کا
دکھ جانتے تھے۔ اپنے دل کو، اپنے خیالات کو، اپنی
سوچوں کو وہ بہلانا چاہتی تھی۔ ایک بھرے پرے گھر
کے درمیان سے اٹھ کر اس کو یہاں میں آنا، معنی
رکھتا تھا۔ وہ تو خیر عمر رسیدہ تھے مگر یہ۔۔۔۔۔ ”سر گھما کر
انہوں نے اسے دیکھا جو اپنی چیمڑے سے اٹھ کر ایک
جانب بھاگی تھی۔ انہوں نے اس کے بھاگنے کے
تغاقب میں دیکھا اور مسکرا دیے۔

کچھ جنگلی خرگوش ادھر آ نکلے تھے۔ سفید اور
چستکے، مریم انہیں پکڑنے کے لیے بھاگ رہی
تھی۔ کیسی شوخ و چنچل تھی وہ، فکر و فکر سے بے نیاز۔
اپنے تمام کزنز کے ساتھ کھیلتی اچھلتی۔ شرارتیں کرتی
اور ثوبان کے ساتھ اس کی جوڑی کتنا چلتی تھی۔ انھار
علی کا دل اداس ہونے لگا۔

کاش ابرار تم باپ کی خواہش کا ہی پاس رکھ
لیتے۔ ایک بیٹے کو میرے نام، میری خواہش کے نام
کر دیتے تو کیا جانا تمہارا۔ نرم گرم دھوپ میں
انہوں نے کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔
اپنوں کے دکھ نے خون میں حدت سے بھر دی۔
ثوبان انہیں کتنا عزیز تھا۔ بالکل مریم کی طرح مگر

دیوار یاد آگئی، در یاد آگیا
دو گام ہی چلے تھے کہ گھر یاد آگیا

کچھ کہنا چاہتے تھے کہ خاموش ہو گئے
دستار یاد آگئی، سر یاد آگیا

اپنے معاملات پہ جب بات آگئی
سب امتیاز عیب دہر یاد آگیا

دنیا کی بے رخی کا گلہ کر رہے تھے لوگ
ہم کو ترا تپاک مگر یاد آگیا

پھر تیر گئی راہ گزر یاد آگئی
پھر وہ چراغ راہ گزر یاد آگیا

اجمل سراج ہم اُسے بھولے ہوئے تو ہیں
کیا جانیں کیا کریں گے اگر یاد آگیا؟

”تم اکتا گئی ہو۔“

”نہیں ابی جان۔ میں آپ کی کمپنی میں بالکل نہیں اکتاتی مگر آپ کی بزرگی..... اور پھر یہاں گھر جیسا آرام بھی تو نہیں۔“ وہ مصحوبیت سے کہتی چلی گئی۔

”ہم چوک پر نہیں بیٹھے بچے۔ یہ بھی گھر ہے۔ تمہاری دادو نے بہت وقت گزارا ہے یہاں اور بے حس اولاد سے یہاں کی تنہائی اور تنگدستی بہتر ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کتاب کے اور اوراق پلٹنے لگے۔

چند ٹاپے سوچنے کے بعد انہوں نے اٹھایا۔ ”مریم ایک کپ کافی لے کر آؤ ذرا اسٹرونگ ہو اور سنو اس سے پہلے سیب کاٹ کر لاؤ، شہوت ہوں تو لے آؤ۔“ جانتے تھے بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کہے گی۔ ایک گہری نگاہ ان پر ڈالتے ہوئے مریم اٹھ گئی۔ اب کچھ بھی کہنا عیب تھا۔

دادا اور پونی ایک دوسرے کی بات بن کہے جان لیتے تھے۔ یہ تو محبت، پیار اور اپنائیت کے انوثہ رشتے ہوتے ہیں کاش..... کاش..... بس اس کاش پر آ کر کرل افتخار علی کی زندگی ٹھہر جاتی تھی۔ ایک دکھ سا پورے وجود میں بکھر جاتا تھا۔ ان کے بچے، ان کی خواہش ہی جان لیتے اور وہ تو بان کا بچہ۔ نالائق کہاں گئی دادا کی محبت۔ کیا یہ رشتے ایسے ثانوی اور دکھاوے کے ہوتے ہیں یا وہ بھی ماں باپ کی طرح لاپٹی ہو گیا ہے۔ وہ دیر سے دیر سے چیخ پر جمو لے، نگاہیں غیر مرمی نکلتے پر مرنے کی سارے محبت آمیز منظور کو سوچے جارہے تھے اور آنکھیں غیر محسوس طریقے سے بھیگ رہی تھیں۔

مجھے یہاں کے لوگوں سے بات چیت کرنا چاہیے۔ تعلقات بڑھانا چاہئیں۔ ایک بند کمرے میں مریم کے لیے رشتے کیسے آئیں گے۔ نئی سوچ نے سر اٹھایا تھا۔ مریم ٹھیک کہتی ہے۔ ہمیں یہاں

کچھ سوشل ورک کرنا چاہیے۔ کچھ کام کرنا چاہیے۔ میل ملاپ سے تعلقات بڑھیں گے۔ ان کے اندر امید کی کرن پیدا ہوئی اور یہ امید ہی ہوتی ہے جو آگے بڑھنے کا محرک بنتی ہے۔ یہاں آ کر زندگی از سر نو شروع ہوئی ہے تو رشتے بھی از سر نو ہوں گے۔ دیر سے خدا کے کرم کی آس لگا کر وہ اٹھ بیٹھے۔

☆.....☆

”میرا خیال ہے مریم ہمیں پہلے ارد گرد کا چکر لگانا چاہیے۔ میں بوڑھا بیمار آدمی کی وقت بھی بیمار پڑ سکتا ہوں۔ مجھے ڈاکٹر کی کلینک کی، کسی ڈسپنری کی ضرورت ہو سکتی ہے۔“ کرنل صاحب نے صبح ناشتے کی ٹیبل پر پرانا اخبار تہہ کر کے ایک سائیز پر رکھتے ہوئے مریم کو دیکھا جو لاؤنج میں لگے شیشے کی دیوار کے پار دیکھ رہی تھی۔

صبح کی چمکتی دھوپ تاحدنگاہ تک پھیلے بڑے پر بکھری چمکتے ہوئے سونے کی مانند لگ رہی تھی۔ بارش کی کرن من کے بعد دھوپ کا تاثر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ ”آج موسم بھی قدرے بہتر ہے۔“ کرنل صاحب بولے تھے۔

”صاحب یہ چند دنوں کی دھوپ ہے اس کے بعد بارش اور پھر برف باری۔ یہ سارا علاقہ برف سے ڈھک جاتا ہے۔ اس طرف پھر کوئی نہیں آتا۔ بہت ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ پھر دھوپ نکلتی ہے تو برف پگھلتی ہے، تب زندگی معمول پر آتی ہے۔“ ناظمہ برتن سمیٹتے ہوئے بتا رہی تھی۔

”ہائے برف باری، اف کتنا مزہ آئے گا۔“ اپنا مگ ٹیبل پر رکھ کر وہ ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

ہاں آپ لوگوں کے لیے یہ مزہ، سیر تفریح ہے۔ مگر یہاں کے لوگوں کی زندگی کٹھن ہو جاتی ہے۔ قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خوراک کا مسئلہ، بیماری، جدائیاں، زندگی، موت سب چار دیواری میں بند ہو

کر رہ جاتے ہیں اور برف پگھلنے کا انتظار کرتے ہیں اور جب برف پگھلتی ہے تو.....!!“ بولتے بولتے ناظمہ کا لہجہ آبدیدہ ہو گیا تھا۔

مریم ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ”جتنا سحر ہے یہاں تا ہی اور درد بھی ہے۔ شہروں میں اور طرح کے مسئلے ہوتے ہیں، یہاں اور طرح کے مسائل ہیں۔ خوراک، رہائش، بیماری، پیسے کی کمی، بے روزگاری۔“

”پھر یہ لوگ شہروں کی جانب کیوں نہیں چلے جاتے؟“ مریم حیرت سے بولی تھی۔

”شہروں میں اتنی جگہ کہاں رہی۔ یہ لوگ نسلوں سے یہیں آباد ہیں۔ آگے ان کی منزل نہیں۔ مسائل ان کے حل نہیں ہو سکتے اور ذرائع ان کے پاس نہیں۔ آپس میں الجھتے لڑتے جھگڑتے بس یونہی۔“ ناظمہ کی آنکھ پھٹکی۔ اسے اپنا کوئی درد یاد آ گیا تھا۔ مریم نے ابی جان کی جانب دیکھا۔ وہ باہر چمکتی دھوپ دیکھتے ہوئے جانے کس سوچ میں گم تھے۔

”پھر یہ یہاں کیا کھاتے ہیں؟“ اس کی حیرت کم نہ ہوئی تھی۔

”خوراک کی کمی کا مسئلہ ہے۔ یہاں درختوں کے پھل برف بن جاتے ہیں۔ کھیتوں کی سبزی برف باری کی نذر ہو جاتی ہے۔ پھر دال چاول، دلیہ اور خشک خوراک پر ان کا گزارہ ہوتا ہے۔ مرغیاں، انڈیاں، کبوتر سب ٹھہر کر مر جاتے ہیں دور..... اور جب برف پگھلتی ہے تو زندگی ایک نیا سانس لیتی ہے۔“ اک ناؤیدہ دکھ اس کے لہجے میں ہلکورے لے رہا تھا۔

”زندگی میں نئے دور آ جاتے ہیں۔ پورا علاقہ ہیل بن جاتا ہے۔ جگہ جگہ جمی ہوئی برف پگھلتی ہے اور پانی نیچے نشیب کی جانب بہنے لگتا ہے۔ سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ لوگ تیز دھوپ کی دعا میں

مانگتے ہیں تاکہ سیلن ختم ہو، پانی سوکھے اور مرد روزگار کے سلسلے میں باہر نکلیں، بیماروں کو گرماش ملے۔ ٹھنڈک اور سردی ختم ہو۔“

مریم دم بخود سستی جا رہی تھی۔ ابی جان بھی اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک کرب اس کے چہرے پر تھا۔ مریم کو اس کا درد اپنے دل میں محسوس ہوا۔ ناظمہ برتن سمیٹ کر چلی گئی۔

”ابی جان ہمیں ان کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ایک لائیکل ترتیب دے کر ان کی مدد کرنا چاہیے اور ہم نے کیا کرنا ہے۔ ہمارے پاس وقت ہی وقت ہے۔“ اس نے دادا سے اپنا دکھ کہا۔

”ہوں۔“ انہوں نے ہلکے سے ہنکارا بھرا۔

”جو ہمارے اختیار میں ہے ہم وہ تو کر سکتے ہیں۔“

”ہوں۔“ ابی جان نے بنور اس کی جانب دیکھا۔ مریم نے نظریں چراغیں اور شاید ہمارا یہاں آنے کا مقصد ہی یہ ہے۔“ سگار ہونٹ میں دبا کر کرنل افتخار احمد اس کے عقب میں نظر آتے منظر کو دیکھنے لگے۔ اس وقت چمکتی دھوپ میں بڑگھاس پر سفید کبوتر، سرمئی کوئل اور سیاہ کوئے آکر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ ان کے عقب میں پوکٹس، سفیدے اور پائن کے درختوں پر ابا بیلوں نے بسیرا کیا ہوا تھا۔ رات کو یہاں سے جتنا گھور اندھیرا بھانک لگتا تھا اس وقت منظر اتنا ہی خوب صورت اور دلکش لگتا تھا۔ مریم نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور مسکرا دی۔

”میری بھی فریاد سن لیں میری بھی دادی کی کر دیں۔“

”جانے، تیری سنی گئی ہے، جاتیاری کر، ہم باہر نکلتے ہیں۔“ کرنل صاحب نے شاہانہ انداز میں کہا اور مریم کو فرش بجالائی۔

Confession.....اعتراف

☆☆☆

اضطراب کی بے چین وادیوں میں
زیست کی بے کنار تہائیوں میں
دیکھو خزاں کوئی رستہ بھولا ہے
خود کو، ہمزاد ہمارا بتلاتا ہے
خیال کی منڈیوں پہ دیے جلائے
آگ میں اپنی خودی جلتا ہے
پہاڑوں کے سبز نقشِ سفر پہ
بھول سارے وہ جنگلی بختا ہے
یونہی ایک دن
چلتے چلتے
باتیں کرتے
سفر کی روانیوں میں
وقت کی نشانیوں میں
بات کی حیرانیوں میں
حرفِ ابجد میں کھلا ایک درملا ہے
لوہِ دل پہ لکھا صرف ایک نام ملا ہے
وہ نام تمہارا ہے
جواب میرا ہے.....

☆☆☆

نگہت نسیم۔ سڈنی

کے سر پر ارد گرد جنگل سے چنی ہوئی سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر تھا۔

”اے سنو۔“ مریم نے آواز دی۔ انہوں نے گھوم کر دیکھا تو اس نے اشارے سے انہیں بلایا۔ ”یہاں کوئی ڈاکٹر ہے۔ کلینک یا اسپتال۔“

”نہیں۔“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر انکار میں سر ہلایا۔

”کوئی اسکول۔“ اب کے دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔

”نہیں۔“ پھر سے انکار میں سر ہلایا گیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ اس نے محبت سے پوچھا۔

”میرا نام زیتون ہے اور اس کا نگار۔“ گلابی کپڑوں والی لڑکی شرماتے ہوئے بولی۔

”میرا نام مریم ہے یہ جو اوپر پیچھے سفیدے کا درخت نظر آ رہا ہے، یہاں ہمارا کانچ ہے۔ تم آنا ادر۔“ مریم نے انہیں گھر کا راستہ بتایا۔

”پڑھو گی۔“ اس نے نگار کی جانب دیکھا۔

”آپ پڑھاؤ گی ہمیں۔“ زیتون کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

”ہاں! تم آنا آنا کہیں بھی دوں گی اور کاپیاں اور پمپلین بھی ہیں میرے پاس۔“

”رنگ برنگی پمپلین بھی ہیں۔“ نگار کی آنکھوں میں شوق تھا۔

”ہاں وہ بھی ہیں تم آنا۔“

”اسے بڑا شوق ہے کاغذ پر چیزیں بنا کر رنگ کرنے کا مگر.....“ کہتے کہتے اس نے دل مسوس کر کے اسے دیکھا۔

”تم آنا اور کوئی بھی پڑھنا چاہے تو اسے بھی لے آنا۔“ مریم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ابی ہاں آگے نکل گئے تھے۔ ”ٹھیک“ یہ کہہ کر وہ آگے

”اگر یہ لوگ آٹھ بجے میرے پاس آ جاتے ہیں تو میرے خیال میں دس بجے میں ان کو فارغ کر دوں۔“ واپسی پر یہ لوگ فروٹ توڑتے، جمع کرتے ہوئے چلے جائیں اور پونے بارہ کے بجائے بارہ ساڑھے بارہ بجے جاسکتے ہیں، اپنی مزدوری کے لیے۔“ مریم نے فخریہ نگاہوں سے سر گھما کر انہیں دیکھا۔

”ذہین دادا کی ذہین پوتی۔“ کرنل صاحب ہنس دیے۔

”سوال یہ ہے۔“ ایک موڑ مڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”تم آٹھ بجے آٹھ جاؤ گی۔“

”اوہ۔“ مریم نے سر کھپایا۔ ”یہ ایک نیک مقصد ہے اور مجھے یقین ہے کہ مجھے آٹھ جانا چاہیے اور پھر آپ ہیں نا۔“ وہ شرات سے ہنسی مچی۔

”کیا مطلب۔“ وہ ٹھٹھک کر رکے۔

”میرا مطلب ہے کہ مجھے اٹھانے کے لیے۔“ اس نے جملہ مکمل کیا۔

”ہوں۔“ قدم آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”میں سب کچھ کر دوں گا مگر مجھ سے بچوں کو پڑھانے کی امید مت رکھنا۔“ کرنل صاحب نے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے اسے وارن کیا۔

”پھر آپ نے اپنے چھ بچوں کو کیسے پڑھایا۔“ اس نے اپنی بات سے خود ہی حنا اٹھایا۔ جواب میں انہوں نے اسے گھورا۔

”وہ میرا نہیں تمہاری دادی کا مسئلہ تھا۔“ اور پھر وہ ارد گرد کا جائزہ لینے لگے۔ مٹی کے کچے کچے مکانات ہاتھ سے بنے ہوئے تھے۔ کوئی پلستر نہیں کیا گیا تھا اور کوئی مکان پکا نہیں تھا۔ کچھ کچیریل کی ترچھی چھتوں والے مکان تھے، جن پر ٹاٹ کے پردے بھول رہے تھے۔ دو نو عمر لڑکیاں ہنستی ہوئی ان کے قریب سے انہیں دیکھتی ہوئی گزر گئیں۔ ان

دونوں تیار ہو کر باہر نکلے۔ ارد گرد کا جائزہ لیتے یہ دونوں شیب کی جانب چلنے لگے۔ آگے کو کچھ بچے سر پر چھابڑیاں رکھے جا رہے تھے۔ کول بڑی بڑی چھابڑیوں میں شہتوت، لوکاٹ، کالے مسالے والے چنے تھے، جسے لوگ نیچے اسٹاپ پر بیچنے جا رہے تھے۔ مختصر بہار بچے ابھی سے روزگار کے سلسلے میں پریشان۔ مریم نے ترم نگاہی سے انہیں آگے آگے جاتے دیکھا۔ کچھ چھابڑیوں میں کچے امرود تھے۔

ایک بچے کو روک کر اس نے مسالے کے ساتھ امرود خریدے اور پھر امرود کترتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

”ابی جان، اسی وقت دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔“ اس نے دادا سے کہا۔

”نہیں پونے بارہ۔“ سر پر ٹوپی ٹھیک کرتے ہوئے کرنل صاحب نے کہا۔

”جی پونے بارہ۔“ سر گھما کر اس نے انہیں دیکھا۔ سر پر ٹوپی بلیک ٹراؤڈر، سرخ شرٹ میں اسٹیک پکڑے دوسرے ہاتھ میں سگار لیے ادر ادر دیکھتے۔ اسٹیک جما جما کر چلتے دراز قد ابی جان پر اسے بے ساختہ پیارا آ گیا۔ اس نے نسکرا کر منہ پھیر لیا۔

”یہاں کے لوگ علی الاصح اٹھنے کے عادی ہیں۔“ صبح آٹھ کر کیا کرتے ہوں گے یہ۔ ادر ادر کھیل تماشاے وقت کا زیاں ہے۔ ان لوگوں کو تعلیم اور تربیت دینی چاہیے۔“ کرنل انھار نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”یہ جو بیچنے کا سامان بھل وغیرہ لے کر جا رہے ہیں اس وقت یہ لوگ یہ سب جمع کرتے ہیں۔“ سگار منہ سے نکال کر انہوں نے انگلی سے ان کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ جو بیچنے کا سامان بھل وغیرہ لے کر جا رہے ہیں اس وقت یہ لوگ یہ سب جمع کرتے ہیں۔“ سگار منہ سے نکال کر انہوں نے انگلی سے ان کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ جو بیچنے کا سامان بھل وغیرہ لے کر جا رہے ہیں اس وقت یہ لوگ یہ سب جمع کرتے ہیں۔“ سگار منہ سے نکال کر انہوں نے انگلی سے ان کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ جو بیچنے کا سامان بھل وغیرہ لے کر جا رہے ہیں اس وقت یہ لوگ یہ سب جمع کرتے ہیں۔“ سگار منہ سے نکال کر انہوں نے انگلی سے ان کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ جو بیچنے کا سامان بھل وغیرہ لے کر جا رہے ہیں اس وقت یہ لوگ یہ سب جمع کرتے ہیں۔“ سگار منہ سے نکال کر انہوں نے انگلی سے ان کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ جو بیچنے کا سامان بھل وغیرہ لے کر جا رہے ہیں اس وقت یہ لوگ یہ سب جمع کرتے ہیں۔“ سگار منہ سے نکال کر انہوں نے انگلی سے ان کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ جو بیچنے کا سامان بھل وغیرہ لے کر جا رہے ہیں اس وقت یہ لوگ یہ سب جمع کرتے ہیں۔“ سگار منہ سے نکال کر انہوں نے انگلی سے ان کی جانب اشارہ کیا۔

بھاگی۔

”ٹھیک ہے۔“ نگار نے سر ہلایا۔ اس کا گھڑ
نیچ کر گیا تھا۔ دونوں لڑکیاں پھر سے ایک دوسرے کو
دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

انہوں نے جہاں تک ہمت تھی وادی کا چکر لگا
لیا۔ یہاں پر غربت، بھوک، مظلومک الجالی کی
بہتات تھی اور ایک بات کا اور ان پر انکشاف ہوا کہ
یہاں کے لوگ اپنی مدد آپ کے تحت زندگی گزارتے
ہیں۔ ان کے آباد اجداد نے اتنا نہیں چھوڑا تھا کہ
اس پر انحصار کیا جائے۔ غریبی نسل در نسل چلتی آرہی
تھی اور گڑھا کھودنے اور روز پانی بھرنے والی مثال
تھی۔ صبح کھاتے، رات کو خرچ کر دیتے تھے اور رات
کو لائی ہوئی اجرت صبح ختم۔

☆.....☆

”ابی جان! یہاں بخیر ہاسپتال کے، بنا کسی
ذاکتر کے یہ لوگ کس طرح سے زندگی گزارتے
ہیں۔ یہ لوگ بیمار بھی ہوتے ہیں۔ شہنڈ بھی لگتی ہے۔
آج کل سردی لگتی ہو رہی ہے۔“ مریم کو دیکھتے
ہوئے ناظمہ مسکرا دی۔ کرنل صاحب نے مچھڑی
کھاتے ہوئے ترجمانی نگاہ اس پر ڈالی۔

”بھری فقیری، حکمت، جڑی بوٹیاں، جو
شانہ ان کی صحت کا راز ہیں بیٹا۔“ انہوں نے
منہ میں نوالہ بھرتے ہوئے کہا۔ مریم ان کی شکل
دیکھنے لگی۔ ”یہاں پر حکیم، جراح، ڈاکٹر کے فرائض
سر انجام دیتے ہیں۔“ انہوں نے گہرا سانس لیتے
ہوئے کہا تھا۔

”خدا ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق
سہولیات فراہم کر دیتا ہے۔“ ان کی بات سن کر وہ
اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

”کل بازار چلیں گے۔ کچھ چیزیں لیتی ہیں۔
اخبار رسالے بھی لیں گے۔“ کرنل صاحب نے پانی

کا گلاس ہونٹوں سے لگایا۔

”ابی جان شکر ہے کہ میں اپنا کمپیوٹر ساتھ لے
آئی تھی۔ مجھے اخبارات وغیرہ کی کسی اتنی محسوس نہیں
ہوتی۔“ اس نے شکر کا سانس لیا تھا اس کا میا بی پر۔
”اور شکر ہے کہ میں اپنا چھوٹا ٹی وی سیٹ ساتھ
لے آیا تھا مگر اخبارات، رسائل، میگزین وغیرہ کی
اہمیت اپنی جگہ مستحکم ہے۔ مطالعہ کی اہمیت سے انکار
نہیں ہے۔“

مریم کچھ جھل سی ہو گئی۔ وہ مطالعہ کی چور بھی۔
اخبار پر سرسری سی نظر ڈالتی تھی۔ سارا کام کمپیوٹر پر
کر لیتی تھی۔ گریجویٹن میں اس کے پاس کمپیوٹر تھا
اور ٹوبان نے اسے اس میدان میں ماسٹر کر دیا تھا اور
یوں مختصر کورسز کی اسے ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔
ہاں گریجویٹن کرنے کے بعد ایک ڈپلومہ ضرور کیا
تھا۔ جاب کرنے کی خاطر۔ فارغ پڑنے سے بہتر ہے
کہ بندہ کچھ کر لے۔ یہ اس کا ذاتی خیال تھا اور وہ
اس پر عمل درآمد بھی کرتی تھی۔

”سنو جاب کے لیے ماری ماری مت پھرنا۔
انٹرویو کے لیے میرے آفس میں آ جانا۔“ اس کا
جاب کے بارے میں خیال سن کر ٹوبان چپکا تھا۔

”تمہارے آفس میں۔“ وہ حیران ہوئی تھی۔
”ہاں! میرے آفس میں۔ بنا کسی تجربے
کے اوکے کر دوں گا۔ آخر میں ہوں نا تجربہ کار
بنانے کے لیے۔“ ٹوبان نے فرضی قابلیت کے
کار چھاڑے تھے۔

”مگر تم تو ابھی خود اپنے پاپا کے دست مگر ہو۔“
”تو کیا ہوا۔“ اس نے ایک ادا سے بالوں میں
ہاتھ پھیرا۔ ”کل میرا ہی تو ہے۔“
”اونہ۔“ مریم نے سر جھٹکا۔

”ویسے میرے دل کے آفس میں صرف تمہارا
ہی اپنا کمنٹ ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مزید پھیلا۔ ”کیونکہ

میرا دل کہتا ہے کہ تم سگھر، سلیقہ مند اور قابلیت رکھتی
ہو۔“

مریم نے کٹن اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا۔
”بلا جھک منہ دھور کھو۔“

”ابھی نہا کر آیا ہوں۔“
”اوہو۔“ وہ ہنسی۔ ”مگر جراثیم نہیں گئے
ہیں۔“ اس نے شرارت سے اسے دیکھا تو ٹوبان
ٹھور کر رہ گیا۔

ٹوبان اور مریم میں تھوڑا سا ہی فرق تھا۔ ایک
دوسرے سے دوستی بھی بہت تھی اور لڑائی اس سے
بڑھ کر ہوتی تھی اور لڑائی میں ہمیشہ ابی جان صلح
کراتے تھے۔ تمام نواسوں پوتے پوتیوں میں انہیں
بھی ٹوبان سب سے عزیز تھا۔ پیارے تو سب ہی
لگتے تھے مگر ٹوبان دل کے قریب تھا۔ اس کا بھراور
اس کا درد دیکھا تھا، جب روڈ پر کرکٹ کھیلتے ہوئے
اس کا شدید ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور وہ دس دن آئی سی یو
میں رہا تھا اور وہ دن قیامت کے تھے۔ اس کے لیے
خصوصی دوائیں مانگی گئی تھیں۔ صدقے، خیرات
کے گئے تھے مگر اب..... کرنل افتخار احمد اکثر گہرا
سانس لے کر رہ جاتے تھے۔

”ظالم بچے نے پلٹ کر خبر ہی نہیں لی کہ اس
کے ابی جان کس حال میں ہیں۔ اس کے بغیر کیسے رہ
رہے ہیں۔ جنگل بیابان، میں کسی چیز کی ضرورت ہو
گی۔ ڈاکٹر سے ماہانہ چیک اپ کیسے ہوگا۔ یہ علاقہ
کچھ دن کی تفریح، بیروسیاحت کے لیے تو ٹھیک تھا
مگر مستقل رہائش کے لیے ناممکن مگر رہ رہے تھے وہ
دونوں اولاد نے بھی نہیں پوچھا تھا۔ سب کے فون
آئے تھے ایک ایک بار مگر سب ٹھیک ہے کہہ کر فون
بند کر دیا جاتا تھا۔ وہ اندر سے اپنی اولاد سے خفا اور
ناراض تھے۔ کیا تھا اگر ایک بیٹا، باپ کے نام پر
قربان کر دیتے مگر لالچ، طمع، ہوس انسان کتنا بھٹکا

ہوا ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے اکثر ان کی سوچ
کہیں کی کہیں سفر کر جاتی تھی۔

☆.....☆

اگلے دن دادا پوتی چندو کو میٹر کا قاصد ملے کر کے
شہر سے ابتدائی افش اردو کی کتابیں، کاپیاں،
پنسلین، بکرنسلس اور بڑے آئے۔ ابی جان نے
اخبار اور رسالوں کا پلندہ بھی خریدا۔
”اتنا کچھ۔“ مریم نے حیرانی سے ان کے
بندل کو دیکھا۔

”اپنے بندل کو دیکھو، میرے ڈبے کو نظر مت
لگاؤ۔“

”پھر ابی جان میں یہ دو بھاری بھاری بندل اٹھا
کر کیسے لے کر جاؤں گی۔ پہلے بھی میں آپ کے
ردی رسالے لے کر آئی تھی اتنی چڑھائی ہے۔“ اس
نے اپنے شانے دہاتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا خیال ہے۔“ انہوں نے تجاہل عارفانہ
پوتی کو دیکھا۔

”اس بندل کی پے منٹ کر دوں۔“ انہوں نے
اس کے پیکٹ کی جانب اشارہ کیا۔

”کرین نا۔ میرا بینک اکاؤنٹ تو آپ ہیں۔“
وہ ہنسی ہوئی۔

”اٹھا لو گی؟“ اسے بلیک میل کیا گیا۔
”اور کون اٹھائے گا میرا بوجھ۔ اپنا بوجھ انسان کو
خود ہی اٹھانا ہوتا ہے۔“ ایک رسالے پر نگاہ پڑی تو
وہ اسے اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”تو میرا بھی اٹھا لو گی نا۔“ انہوں نے سنجیدگی
سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ بھونچکی رہ گئی۔
”جی! یہ دونوں بندل آپ نے اٹھائے ہیں اگر
نہیں اٹھا سکتی ہو تو اپنا بندل کھلا دو۔“ کرنل صاحب
نے شفاف اردو میں کہا اور منہ پھیر لیا۔

بستہ پھینک کے لوچی بھاگا

روشن آراباغ کی جانب

چلا تا "چل گڈی" چل

کے جاسن چکیں گے

آنگن کی رسی سے ماں نے کپڑے کھولے

اور تھوپ لاکے ٹیبن کی چادر ڈالی

سارے دن کے سوکھے پاؤ

بھی نے چادر میں لپیٹے

"بچ گئی رہا! کیا کرایا دھل جاتا تھا"

خیر و نے اپنے کھیتوں کی سوکھی مٹی

جبریلوں والے ہاتھ میں لے کر

بھگی بھگی آنکھوں سے بھر اوپر دیکھا

جھوم کے پھراٹھے ہیں بادل

ٹوٹ کے پھر مینہ بر سے گا

کے نیچے گھاس اگانے پر زیادہ توجہ دی تھی۔ دائیں جانب کی دیوار کو بلیک مگر سے پینٹ کر دیا گیا تھا۔ یہ مقام اس اسکول کی جگہ تھی جہاں بچوں نے آکر پڑھنا تھا۔ بلیک بورڈ کے بائیں جانب دن کا راجہ اور رات کی رانی کی باڑیں تھیں۔ مسور کن خوشبو فضا میں مہکتی رہتی تو رات کو ہوا کے دوش پر اڑتی، لہراتی، رقص کرتی درپچوں اور دروازوں سے اندر آ جاتی تھی۔

"ناظمہ ان بچوں سے پوچھو کہ پڑھیں گے۔" مریم نے تیز تیز کام کرتے شیش اور سلیم کی جانب اشارہ کیا۔

"ان کا بابا بیمار رہتا ہے۔ دونوں چھابڑی لگاتے ہیں تو کچھ دال دلیہ ہو جاتا ہے۔"

"مگر ناظمہ جب تک یہ پڑھیں گے نہیں تو ترقی کیسے کریں گی۔ کیا یہ ساری عمر چھابڑی لگاتے رہیں گے یا بہت ہوا تو چھابڑی سے ریڑھی تک ترقی کر لیں گے۔ اس سے کوئی بہتری تو نہیں آئے گی نا۔" اس نے فلسفہ جھاڑا۔

"کوئی دوسرا کمانے والا ہو تو کچھ کریں نا۔" ناظمہ نے مجبوری بتائی۔

"ان کو زیادہ تعلیم کی ضرورت ہے۔ ان کا باپ بیمار ہے تو آگے چل کر گھر کے کمانے والے بھی رہیں ہوں گے۔ کیا کرتا ہے تمہارا بھائی۔" اس نے ناظمہ سے پوچھا۔

"پچھل فردٹ کا ٹھیلہ لگاتا ہے۔" ناظمہ نے سر جھکا لیا۔

"وہ ٹھیلہ ان بچوں کو منتقل کر دے گا۔" مریم کو غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

"کیا کریں گی۔ یہاں کے موسم، حالات، مہنگائی اور بیماری پھر زیادہ بچے..... بس پھر یہی ہوتا ہے یہاں۔"

پکار رہے تھے۔

"جی ابی جان۔" مکن کی بڑی سی کھڑکی سے اس نے باہر کی جانب دیکھا۔ جہاں سے داخلی گیٹ بھی نظر آرہا تھا۔ دو بچے ہاتھ میں خرکوش پکڑے کھڑے تھے۔ ٹیکین سے ہاتھ صاف کرتی وہ باہر بھاگی۔ "تمہارے خرکوش آگئے ہیں۔" ناظمہ بھی ان کے پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ دونوں لڑکوں کے ہاتھ میں چار چھوٹے چھوٹے خرکوش تھے۔ سفید رنگ کے۔ دو کی آنکھیں سرخ اور دو کی کالی سیاہ تھیں۔ ایک کو پکڑ کر اس نے کود میں بھر لیا۔

"یہ سلیم ہے اور یہ شیش، میرے بھائی کے بچے۔ میں نے انہیں کہا تھا خرکوش لانے کے لیے۔ بچے ہیں یہ بچے جلدی مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ جنگلی خرکوش تھے وہ جنگل میں ہی خوش رہتے، انہیں گھر کا ماحول ملے گا تو یہ مانوس ہو جائیں گے کہیں جائیں گے، نہیں۔" ناظمہ شوق سے بتا رہی تھی۔

"جاشیش اس کو نے میں ادھر دیوار کے ساتھ ان کا پنجرہ رکھ دے اور پانی کا انتظام بھی کر دے۔" ناظمہ نے سنجیدگی سے کام بتایا۔

"اچھا بھولی۔" دونوں بائیں جانب چلے گئے۔ مریم دو خرکوشوں کو کود میں رکھے انہیں پیار کر رہی تھی۔ ابی جان نے اس پر نظر ڈالی اور پھر دوبارہ سے پودوں کی کانٹ چھانٹ شروع کر دی۔ ان کا یہ چھوٹا سالان سنور گیا تھا۔ پھولوں کی کیار یوں میں جو بیج ڈالے تھے ان سے کوئلیں پھوٹ پڑی تھیں۔ بوگن دلیلا اور پائٹن کی بیللیں، اب دیواروں پر ری کے سہارے چڑھ رہی تھیں۔ اس میں مریم اور کرل اختراع علی دونوں کا حصہ تھا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ دھوپ سینکنے کے بہانے ادھر ہی گزارتے تھے۔ ایک پتھر دکان ہو جاتے تھے۔

مریم نے پوکپش، پائٹن اور کھجور کے درخت

"ابی جان۔" وہ بھڑک ہی تو اٹھی تھی۔ "ابھی کھانے پینے کی اشیاء بھی لینا ہیں۔" انہوں نے جیسے اسے ڈرایا۔ اس کی آنکھیں میل گئیں۔

"تمہیں تو معلوم ہے میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کہاں وزن اٹھا سکتا ہوں۔"

مریم نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا جو کل تک کہتے تھے فوجی نہ تھکتے ہیں، نہ بوڑھے ہوتے ہیں۔ ان کے دل جوان ہوتے ہیں۔ کرل اختراع کے چہرے پر دہلی دہلی مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے چھیڑ رہے تھے اور دکاندار بن رہا تھا۔

"میں صعب نازک ہوں۔ اتنا سامان میرے اوپر بوجھ ہو گا اور یہ ظلم ہے۔" اس نے دہائی دی۔ "اور جو خود کو فوجی کی بیٹی اور فوجی کی پوتی کہتی ہو۔" انہوں نے گھورا۔

"تو اس میں کیا شک ہے۔" وہ کندھے اچکا کر کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے انہیں چڑانے لگی۔ "وہ تو میں ہوں۔"

کرل اختراع بنس دیے۔ مریم کھلکھلا دی اور پھر انہوں نے بازار سے واپسی پر پٹ پٹھ سے چنے کی چاٹ کھائی۔ آٹس کریم خریدی، سامان دکان میں ہی رکھوا کر پورے بازار کا ایک چکر لگایا۔ چند اور ضرورت کی چیزیں خریدیں اور پھر بھٹا کھاتے ہوئے وہ کرل صاحب کا دامغ بھی کھاتی رہی۔

☆.....☆

"ناظمہ بچوں کو لاؤ نا پڑھانے کے لیے۔" اگلے دو دن تک انتظار کرنے کے بعد آخر اس نے ناظمہ سے کہا۔

"ہاں میں کل نیچے وادی میں جاؤں گی تو بچوں کو بتاؤں گی جن کو شوق ہوا وہ آجائیں گے۔"

"مریم!..... مریم!" باہر لان سے کرل اختراع

مریم تاسف اور ملال سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
”کل تم گھر جانا اور اپنے بھائی کو سمجھانا۔ یہ لڑکے
سمجھدار ہیں، کچھ پڑھ لیں گے۔ زیادہ نہیں بس اردو
لکھنا اور پڑھنا آجائے، حساب کتاب سمجھ لیں تو
زیادہ اچھا کام کر سکتے ہیں۔ کسی دکان میں کھڑے ہو
سکتے ہیں۔ منڈی میں بھاؤ تاؤ کر سکتے ہیں۔ لکھنے
پڑھنے کا کوئی بھی اچھا کام کر کے زیادہ اچھا کام کر سکتے
ہیں۔“

ناظمہ ہونٹ سی ان کی شکل دیکھنے لگی اور ابی جان
نے ہاتھ روک کر اپنی ذہین پونی کو سراہنے والے
انداز میں دیکھا۔

”بات کرنا تم بلکہ ایسا کرو کہ تم انہی کے ساتھ
چلی جاؤ۔ کل آجانا اور انہیں بھی ساتھ لے کر آنا صبح
دو گھنٹے پڑھ لیں بس کافی ہوں گے۔“ مریم نے
آئندہ کا لائحہ عمل طے کر کے ٹائم ٹیبل بھی ترتیب
دے لیا۔

”اور بچے کون صبح صبح کام پر چلے جاتے
ہیں۔ لے کر آنا انہیں کتابیں، کاپیاں میں دوں گی۔
بس یہ آجائیں۔“ اس نے پھر اصرار کیا اور ناظمہ سر
ہلاتی اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

ایک خرکوش پھد کر اس کی کود سے نکلا اور
بھاگتا ہوا شفیق کی جانب چلا گیا۔ اسے جاتے دیکھ کر
دوسرا بھی چلنے لگا۔ مریم نے اس کے بالوں میں ہاتھ
پھیر کر اسے چھوڑ دیا اور وہ دوڑتا ہوا اپنے ساتھی کے
پاس پہنچا۔ چاروں بچہ رے میں بند ہو گئے۔

”یہ بھائیوں کے تو نہیں؟“ اس نے شفیق سے
پوچھا۔

”نہیں یہ اپنے بچہ رے سے مانوس ہیں۔ ادھر
ادھر کھیلیں گے۔ پھر ادھر اہوتے ہی ادھر آجائیں
گے۔ آپ انہیں دانا پانی، ان کی پسند کی خوراک
دے کر ان سے دوستی کر لینا، پھر یہ کہیں نہیں جائیں

گے۔“ شفیق نے بتایا۔

دونوں بچوں کے حلیے میلے کچیلے ہو رہے تھے
۔ بالی بڑھے ہوئے تھے۔ غربت چہرے سے ٹپک
رہی تھی۔ آنکھیں اندر کو ہنسی ہوئی۔ افلاس جن کے
گھر کا رستہ دیکھ لے وہاں سے غربت جانی ہی
نہیں۔ مریم کو بہت ملال ہوا۔
”پڑھو گے؟“ اس نے شفیق کے شانے پر
ہاتھ رکھا۔

وہ بارہ چودہ سال کا بچہ اس کی جانب دیکھ کر
بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔

”ابا سے پوچھ کر بتاؤں گا۔“ بچے نے
معصومیت سے جواب دیا۔

”ابا سے کیوں.....“ اس نے سینے پر ہاتھ
باندھ کر انہیں دیکھا۔ میٹالے سے رنگ کے کپڑے،
قدرے اونچی کی ہوئی شلوار، میلے کچیلے پیروں میں
کالے رنگ کی چپل۔

”پڑھنا تمہیں ہے، شوق تمہیں ہے۔ پڑھائی
تمہارے کام آئے گی۔“ اس نے بچوں کو جذباتی طور
پر ایوٹھل کیا۔ ”تمہیں شوق ہے پڑھنے کا۔“
”ہے جی کیوں نہیں۔ بچپن میں مجھے جہاز

چلانے کا اور اسے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا مگر.....“ اس
کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔

”پتا نہیں غریبوں کو یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی
کہ جب وسائل نہیں تو اتنے بچے پیدا کیوں کرتے
ہیں۔ وقت سے پہلے اپنے بچوں کو بڑا کیوں کر دیتے
ہیں۔ نہ وہ اپنا بچپن بچوں کی طرح گزار پاتے ہیں
، نہ جوانی جوانوں کی طرح۔ ایک دم سے تفکر اور فکر
فردا کے بادل لے کر بڑھاپے میں گھس جاتے ہیں۔“
وہ سوچنے لگی تھی کیونکہ شفیق کا باپ کمزور ناتواں بیمار
تھا۔ اب اس کی جگہ بچے کمانے جارہے تھے۔

”اب تم پڑھ سکتے ہو۔“ اس نے ان کے

چہروں پر لکھا تذہب پڑھ لیا۔ ”میں تمہارے ابا سے
بات کروں گی۔ تمہاری پھوپھو کو اس لیے ابھی
تمہارے ساتھ بھجوا رہی ہوں۔“ اس نے مسکراتے
ہوئے انہیں آگاہ کیا۔

”جی! شفیق کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
”جی۔“ مریم نے اس کی ناگ دہائی۔

پڑھائی کا شوق ان کی آنکھوں سے ہویدا تھا اور
مجبوریوں کے بندھن پیروں سے لپٹے نظر آ رہے
تھے۔ ناظمہ ان کے ساتھ چلی گئی۔

☆.....☆

موسم آج کل بہت سرد ہو رہا تھا۔ پہاڑی علاقہ
تھا اس لیے سردی زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ ابی
جان روکنگ چتر پر آتش دن کے قریب بیٹھے تھے۔
ہاتھ میں موٹی سی کتاب بھی شاید مستنصر حسین تارڑ کا
کوئی سفر نامہ تھا۔ وہ خود بھی کمپیوٹر آن کر کے بیٹھ گئی۔
فضا میں گہری خاموشی تھی۔ پہاڑی کوئے بھی
بہاروں کی سیاحت کے بعد پتیل کے پیڑ پر جو
استراحت تھے۔ تاہم باہر کی دنیا میں مینڈک کی
ٹراہٹ اور جھینگروں کی موسیقی تھی۔ خاموش ساکت
دنیا میں ایک مخصوص سادہم تھا جو باہر نکل کر سنا جاتا
تو اچھا خاصا خوفناک تھا۔

☆.....☆

ناظمہ ایک دن بعد آئی اور اپنے ساتھ بہت
سارا سامان، طعام اور مہمان لائی جنہوں نے اب
ادھر کے رہائشی بننا تھا۔ طعام میں سرسوں کا ساگ،
کئی کی روٹی، میٹھی گندم اور تیل کے لڈو میوے والا گڑ
اور شکر میٹھی جیسے پاکرانی جان کی تو عیدی ہو گئی تھی۔
ساتھ میں وہ چھوٹے چھوٹے مرفی کے بچے اور
کبوتر لائی تھی۔ مریم اچھل ہی تو پڑی۔ سرخ سبز
براؤن پیلے چوڑے چوں چوں کرتے ادھر ادھر
بھاگنے لگے تھے۔

”کل ہی انڈوں سے نکلے تھے۔ آدھے میں
لے آئی آدھے ادھر ہی ہیں اور ابا گاؤں سے آیا ہوا
تھا، اس لیے ساگ اور مٹی کا کھانا لے کر آئی ہوں۔“
”ناظمہ بھائی سے بات کی؟“ مریم نے کل
والی بات کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں میں نے بھائی سے بات ہی نہیں کی بلکہ
انہیں سمجھایا بھی۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی ہے۔
بچے پڑھیں بھی، کمائیں بھی۔ بھائی کو اور کیا
چاہیے۔“ ناظمہ نے خوش خبری دی۔

”پھر دو چار گھنٹے کی تو بات ہے۔ اسکول میں
تین بجے چمچی ہوئی ہے۔ اسکول نیچے اتر کر دو
اسٹاپ کے بعد جو گاؤں آتا ہے ادھر ہے۔ گھر
آتے آتے چار بج جاتے ہیں۔ سارا دن غرق،
اس لیے بھائی اسکول داخل نہیں کرواتا۔“ ناظمہ
نے تفصیل بتائی۔

”میں ان چوڑوں کو لے کر آئی ہوں مریم بی بی
مگر سردی بہت ہے اور آنے والے دن برفباری کے
ہیں اور انہیں گرمائش کی ضرورت ہے۔“

”تم ان کا پیچہ لانا ہی ہونا؟“ سرخ رنگ کا پھولا
پھولا چوڑہ اس نے پھیلی پر لے لیا۔

”ہاں جی وہ تولائی ہوں۔“

”بس آج سے یہ چھ کے چھ چھوٹے ہمارے
ساتھ، اس کمرے میں رہیں گے اور ان کی جگہ آتش
دان کے قریب ہوگی اور تم روزانہ کا پیچہ ادھر ہی
صاف کر دینا۔“ اس نے مسئلہ حل کیا۔

ابی جان اس کا شوق اور دلچسپی انتہائی غور سے
دیکھ رہے تھے۔ مریم نے اپنے لیے مصروفیت ڈھونڈ
لی تھی۔

بچے صبح پڑھنے آجاتے۔ وہ جاتے تو ان
جانوروں کی مصروفیت تھی اور وہ بہت خوش تھی مگر وہ
اس خوشی کے ساتھ ہمیشہ تو نہیں رہ سکتی تھی۔

ایک اضطراب سا ان کے وجود میں سرایت کر گیا۔ اسے ایک گھر، ایک تحفظ، ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ ان کی زندگی کب تک تھی؟ اور کب تک وہ ان کے ساتھ رہ سکتی تھی؟ شادی کے دن یہ ہی تو تھے۔ انہوں نے ایک ماں کی نظر سے جھکتے چہرے والی مریم کو دیکھا۔ دن ڈھلتے کون سی دیر لگتی ہے۔ شام ہی تو ہے۔ کیا کریں۔ دھیرے سے اٹھ کر وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ مریم دادا کے مضطرب وجود کو محسوس ہی نہیں کر سکتی تھی۔

☆.....☆

اگلے دن سے سلیم اور شفیق پڑھنے کے لیے آگئے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکا اور تھاراجو۔ اس نے انہیں کاپیاں، کتابیں، پنسلیں دیں اور بڑی محبت سے پڑھایا۔

”باجی میرے ساتھ، میری بہن بھی ضد کر رہی تھی آنے کی۔“ راجو نے پنسل سے ”ج“ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”تو لے آؤ بیٹا نہیں بھی۔ وہ بھی پڑھ لے۔ کل ضرور لے کر آنا۔ کیا نام ہے اس کا۔“

”یا سکین۔“ راجو نے جھٹ بہن کا نام بتایا۔

”اور سلیم تمہاری بہن نہیں ہے۔“

”میری چار بہنیں ہیں۔ گھر کے کام کرتی ہیں۔

اماں کا ہاتھ بٹائی ہیں۔ ان کے پاس ٹائم نہیں ہوتا۔“

سلیم نے مجبوری بتائی۔

”تو تم دو بہنوں کو صبح اپنے ساتھ لے آیا کرو۔

دو دوپہر کو آجایا کریں گی۔“ شفیق ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کام کرو۔ توجہ سے۔“ اس نے ڈنٹا۔

”میں اماں سے کہوں گا۔“ سر جھکا کر وہ سس

لکھنے لگا اور ایک سرخوشی مریم کے وجود میں سرایت

کرنے لگی۔ نیکی کرنے کا احساس ہی کچھ اور ہے۔

☆.....☆

کرل افتخار احمد صبح واک کے لیے نکلے تو دوسرے بنے ہوئے کالج کی جانب آ نکلے۔ اس سے پہلے وہ اس طرف بھی نہیں آئے تھے مگر اب مجبوری تھی۔ اب شاید کوئی ٹیلی ہو، شاید کوئی امید کی کرن ہو اور شاید ان کی مراد بر آئے۔ جذبے سے ہوں تو خوشی مل ہی جاتی ہے۔

سبز رنگ کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان کے قدم رک گئے۔ ایک مرد اور عورت کھڑے تھے۔ کرل افتخار نے رک کر ان سے مصافحہ کیا۔

”میرا نام کرل ریٹائرڈ افتخار احمد ہے۔ وہ سفید کالج پینل کے درخت والا میرا ہے۔“

”میرا نام محمد لغاری ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ ہم

لوگ یہاں چھٹیاں گزارنے آتے ہیں۔ ہمارے

ساتھ ہمارا بیٹا عمر بھی ہے۔ وہ امریکہ سے آیا ہے۔

یہاں شمالی علاقہ جات کی سیر کرے گا۔“

”ہوں۔“ افتخار احمد اندر سے خوش ہو گئے۔

امید کا ایک در کھلا تھا۔

”میرے ساتھ میری پوتی ہے مریم، آئیے گانا

ہمارے گھر۔“

”ضرور ضرور۔“ انہوں نے اپنی بیگم کو دیکھا۔

”ذرا گھر وغیرہ سیٹ کر لیں۔“

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو۔۔۔۔۔“ کرل صاحب

نے غصانہ آخر کی۔

”نہیں ہمارے ساتھ ہر چیز ہے۔ منرل واٹر،

خشک خوراک کا ذخیرہ وغیرہ وغیرہ۔“ وضاحت پیش

کی گئی تھی۔

”او کے۔“ کرل افتخار دوبارہ آگے بڑھ گئے

تاہم ان لوگوں کو دیکھ کر اب انہیں کچھ تسلی ہونے لگی

تھی سرخوشی میں ان کے قدم تیز تر اٹھنے لگے۔

☆.....☆

دن بڑے مزے میں گزرنے لگے تھے۔ روپیلی و سنہری دھوپ میں کھلے ہوئے لان میں بیٹھ کر بچوں کو پڑھانا بہت اچھا لگتا۔ بچوں کو پڑھنے کا شوق تھا۔ انہیں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تھی۔ ان میں آگے بڑھنے اور پڑھنے کا جذبہ بھی تھا۔ ان کے ساتھ کچھ اور بچے بھی آگئے تو اس کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔

ابی جان نے مریم کو بتادیا تھا سنے پڑوسیوں کے متعلق اور دونوں اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ہفتہ گزر گیا وہ لوگ نہیں آئے تو مریم نے اگلے ہفتے ٹرے سجا کر ان کے گھر ناظرہ کے ہاتھ بھجوا دی۔

موسم بدل رہا تھا۔ اب شام ہوتے ہی رات میں بدلنے لگتی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ناظرہ نے گھر کے آخری کونے میں لکڑیاں

ذخیرہ کرنی شروع کر دی تھی۔ ناظرہ کا مشورہ یہ بھی تھا

کہ خشک خوراک، دالیں، چاول، گندم، آلو، پیاز

وغیرہ جمع کرنا شروع کر دیں۔ کسی وقت، کسی دن بھی

برفباری شروع ہو سکتی ہے۔ ابی جان کا ارادہ تھا کہ

ایک چکر مار کٹ کا لگا لیں اور ایک شہر کا کچھ رقم نکلوا

لیں، ان کی پینشن بینک میں چلی جاتی تھی۔

مدحت ولا، والوں نے شاید باپ اور بیٹی کو بھلا

دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے تذکرہ نہیں کرتے

تھے مگر دل میں خیال بھی جاگتے تھے اور دھیان میں

درہ بھی آنکھوں کو نم کر دیتے تھے۔ مگر ان لوگوں کی

بے حسی کا جو نہیں ٹوٹا تھا۔

کرل افتخار کا دل بے حد پر مال تھا۔ ٹوہان

سے انہیں یہ توقع نہیں تھی مگر شاید اس نے بھی باپ

کے نقش قدم پر قدم جمالیے تھے۔

اگلے دن جب موسم بے حد سرد ہو رہا تھا۔ عصر

سے ذرا پہلے یہ لوگ محمد لغاری کی جانب نکل آئے۔

ان لوگوں نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا۔

گھر میں تمام گلزار ان کی امارت ظاہر کر رہی تھیں۔ ”دراصل مصروفیت تھی۔ آتے ہی فلو نے حملہ کر دیا۔ اب ذرا طبیعت بہتر ہے۔“ عمر تو ابھی تک بستر پر ہے۔ ٹھہریں میں ملوانا ہوں۔“ لغاری صاحب نے مریم کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

مسر لغاری چائے کے لیے اپنی ملازمہ کو آواز دینے لگیں۔ اس وقت ٹلگے سے حلیہ میں ناک پر رومال رکھے، چھینکے مارتا ان کا بیٹا آ گیا۔ شاید اسے حدت بھی تھی چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”میرا بیٹا عمر لغاری۔“ محمد لغاری نے بیٹے کا تعارف کرایا۔

”آ۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ السلام علیکم!“ عمر نے چیونٹک مارتے ہوئے سلام کیا تو یکدم سب ہنس دیے۔

”موسم کا ٹیک ہے۔“ کرل صاحب بولے۔

”ایسا ویسا! ماحول سے مطابقت کے لیے یہ

ایک ضروری ہوتا ہے۔“

مریم خاموش بیٹھی مگ ہاتھ میں لیے سنتی اور

ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

”آپ کیا کرتی ہیں؟“ عمر نے ڈائریکٹ اس

سے سوال کیا۔

”کچھ نہیں فارغ رہتی ہوں، یہاں ہو بھی کیا

سکتا ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”ارے میری پوتی بڑے کام کی ہے۔ میری

خدمت کرتی ہے۔ اتنے ڈیر سارے مشاغل ہیں

کر۔۔۔۔۔“

”ابی جان۔“ اس نے خشکی کے تاثر سے انہیں

ٹوکا تو وہ ہنس دیے۔

”آئیے گا اور ملاحظہ فرمائیے گا۔“ کرل

صاحب بولے۔

”ضرور۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔“ عمر بھلے چنگے انداز میں

صوفے پر پاؤں رکھے بیٹھا۔ کرل صاحب کو لطفے سنا

رہا تھا اور وہ ذوق و شوق سے ان سے محفوظ ہوتے اور گرد سے بے خبر تھے۔

”ابی جان پانچ بج رہے ہیں۔“ مریم نے توجہ دلائی۔

”اوہو ہاں چلو بیٹا اندر چل گیا ہو گا اور لائٹ بھی راستے میں نہیں ہے۔“ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کل آئے گا۔“ لغاری صاحب نے چلتے چلتے آفری۔

”فرد ضرور۔“ محمد لغاری کے بجائے عمر لغاری انہیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہوا سر ہلاتا تھا۔

”آپ بھی ابی جان جہاں بیٹھے ہیں ادھر کے ہی ہو جاتے ہیں۔“ اس نے ناراضگی سے انہیں دیکھا۔

”کیسی باغ و بہار ایسی شخصیت ہے باپ بیٹے کی۔“ وہ اب بھی وہیں تھے۔ کسی پر اتنی جلدی، اتنا اعتبار نہیں کر لیتے ابی جان۔“ اس نے سمجھایا۔

”بیٹے جی! اس دیرانے میں اتنے عرصے بعد کچھ اپنی اپنی سی شکلیں نظر آئی ہیں۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ ورنہ میں تو تمہاری اور ناظمہ کی شکل دیکھ کر بور ہو گیا تھا۔“ کرنل صاحب لکڑی کا پھاٹک کھول کر اندر داخل ہوئے اور پھر چند سیڑھیاں چڑھ کر لکڑی کا دروازہ اور پھر گلاس ڈور کھول کر لاؤنج میں داخل ہو گئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا نہیں کہ مریم خٹکی سے انہیں دیکھ رہی ہے اور پھر وہ خود ہی قدم بڑھا کر ان کے پیچھے بھاگی تھی۔

”لیکن میں آپ کی شکل دیکھ کر بور نہیں ہوئی، کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ میرا دل اور آخر آپ ہی ہیں۔ میں نے آپ کے سائے تلے زندگی گزاری ہے۔“ بولتے بولتے اس کا لہجہ بھرا گیا۔

”آج آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ میں آپ پر

بوجھ ہوں اور آپ آپ صرف میری وجہ سے اس جنگل بیابان میں رہ رہے ہیں۔“ وہ فلور کشن پر گری گھٹنوں پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور کوٹ اتار کر بیٹنگ کرتے اس پر ادنی ٹوپی لگاتے کرنل افشار احمد نے پلٹ کر اسے دیکھا اور چونک گئے۔ کس بری طرح رو رہی تھی وہ۔

”مریم..... مریم! یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹا۔ وہ تو سب مذاق تھا۔“ وہ بے چینی سے اس کے قریب آ کر بیٹھے اور اس کا سر اٹھایا۔

”مجھے آپ ہائل میں داخل کرادیں اور آپ واپس چلے جائیں۔ یہ موسم، یہ تنہائی آپ کے لیے بہتر نہیں ہے۔ آپ..... آپ.....“ اس نے ناراضی سے ان کا ہاتھ جھٹکا۔

”بری بات بیٹا ایسے نہیں کرتے تم..... تم جانتی ہونا کہ.....“ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مریم ان کی بات کا اتنا اثر لے گی۔ انہوں نے پیار سے اسے منایا۔

”میں اپنے بیٹے کے ساتھ بور ہو سکتا ہوں بھلا۔ یہ چکن، یہ کیوٹ، یہ خرگوش وہ دو چھوٹی چھوٹی بلیاں، کتنا مکمل گھر ہے۔ تنہائی کیسی۔“ انہوں نے اسے پیار سے چمکایا۔

اور وہ خٹکی سے انہیں دیکھتی ہوئی غصہ دی، انہوں نے پھر سے شرارت کی۔

”مگر ایک مسئلہ ہے کہ یہ شہر خنچ نہیں کھیل سکتے۔“

”ابی جان۔“ وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ کرنل صاحب کھلکھلا کر غصہ دیے۔

اسی دوران ناظمہ انہیں کھانا لگنے کی اطلاع دے رہی تھی۔ دادا پوتی کی بھرپور محبت اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ بلکہ کوئی بھی محبت پہلی بار دیکھی تھی۔ محبت نے کبھی اسے نہیں چھو ا تھا اور شاید جہاں افلاس

ہو مفلوک الحالی ہو وہاں محبت قیام نہیں کرتی۔

☆.....☆

اس بار صبح سے شام تک کے لیے کرنل افشار احمد اکیلے ہی شہر گئے تھے۔ واپسی پر ڈیڑھ سا سامان، کتابیں اور مریم کا فراموشی پر ڈراما تھا۔ مریم شوق و دلچسپی سے صبح کی روچھلی سنہری دھوپ میں لان میں بیٹھ کر بچوں کو پڑھاتی تھی۔ شفیق کہیں سے ایک سفید رنگ کا کتا لے آیا تھا۔ چوکنداری کے لیے وہ بہت ٹھیک تھا۔ آج کل ابی جان اسے خود سے مانوس کر رہے تھے۔

اس روز جب سنہری دھوپ میں وہ بچوں کو خدا ایک، رسول ایک ہے، ہمیں اس کی پیروی کرنا چاہیے پڑھا رہی تھی کہ پھاٹک کا دروازہ کھلا اور عمر اپنی والدہ کے ساتھ اندر آ گیا۔ مریم نے بڑے سکون سے گھاس سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔

”تم نے تو اچھا خاصا اسکول کھولا ہوا ہے ادھر۔“ مسز لغاری کے کہنے پر مریم غصہ دیں۔

”ایسی تنہائی میں یہ مشغلہ برا نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے عمر نے ایک طائرانہ نگاہ بچوں پر ڈالی اور مریم پر روک دی تھی۔

”ابی جان اندر ہیں۔ ناظمہ انہیں اندر لے جاؤ۔“ اس نے مڑ چھپتی ناظمہ سے کہا تو وہ اندر بڑھ گئی۔

”اوہو یہ تو یہاں چھوٹا سا Zoo بھی ہے۔“ چوزوں کا بنجرہ، کیوٹ کا بنجرہ کوئے میں کھیلنے خرگوش، دھوپ سے تپتی بلیاں اور پال سے کھیلا ڈوگی۔ عمر شوق اور دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”یہ سب آپ کے شوق ہیں۔“ عمر، مریم کے قریب رکا۔

”جی۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتی مسکرائی۔

”ویلدن..... ویلدن۔“ وہ اسے سراہتے

ہوئے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

ٹوبان کی شاپت دیتا عمر لغاری جانے کیوں اسے عجیب سا لگا۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ عقاب سی۔ کچھ جرب زبان بھی لگا۔ چالپوس ٹاپ کا مسلسل بے لاگ بے معنی بول سکتا تھا۔

عمر کو دیکھ کر اسے ٹوبان یاد آ گیا تھا۔ اسی لیے وہ ابی جان کے سامنے ناراضی کا اظہار کرتی روئی تھی۔

☆.....☆

بہت عرصے بعد ٹوبان کی کال آئی تھی مگر اس نے ریسپونڈ نہیں کی۔ ٹوبان نے اسے محبت دی تھی۔ محبت کا اعتماد نہیں دیا تھا۔ محبت میں اعتماد نہ ہو تو محبت بے اعتبار ہوتی ہے اور ٹوبان کی محبت بے اعتبار تھی۔ وہ اس کے لیے اسٹینڈ نہیں لے سکتا تھا۔ گھر والوں سے لڑ نہیں سکتا تھا۔ محبت کو امان نہیں دے سکتا تھا۔ اسے اپنے آدرش عزیز تھے۔ اس کی خواہشوں کی فہرست میں اس کا نمبر سب سے آخری تھا اور آخری خواہش پوری نہ بھی ہو تو گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔

اس کے موبائل پر اس کا ایس ایم ایس بھی آیا تھا اور آئی مس یو کا میسج پڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

امیدوں کی سب دل میں مت جلاتا اس جہاں سے الگ دنیا مت بسانا آج موڈ میں ہو تو ایس ایم ایس کر رہے ہو

روز روز انتظار میں پلکیں مت بچھانا اس نے آج صبح مستقل طور پر اپنا سیل آف کر دیا تھا۔ کیا فائدہ ایسی آکاس تیل اسی محبت کا۔ وہ بہت حقیقت پسند لڑکی تھی۔ کاندھی خواب اور کاندھی خوشبو اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔

”باجی میں نے کام کر لیا ہے۔“ زیتون اس کے پاس آ گئی۔ اس نے سر جھٹک کر اسے دیکھا اور دھیرے سے کاپی تمام لی۔ یہ مصروفیت دھیان بنانے کے لیے کافی ہے۔ مجھے یقین ہے برفباری

کے بعد جو برف پچھلے گی تو سب کچھ گندہ مچھوٹوں کا مدفن ہو جائے گا۔ یقیناً محبت، اعتماد، یقین اور شری بندھن میں مجھے ملے گی۔“ یہ سب سوچتی وہ دھیرے دھیرے بچوں کا کام چیک کرنے لگی اور پھر وہ مسکراتے ہوئے انہیں ہوم ورک دینے میں مصروف ہو گئی۔

☆.....☆

”کیا بات ہے ناظمہ! تمہاری برفباری ابھی شروع نہیں ہوئی۔“ اس نے ڈرائی فرسٹ سے شغل کرتے ہوئے ناظمہ کو دیکھا۔

”لوگ تو دعا کرتے ہیں کہ برفباری نہ ہو۔ تاکہ نئے مسئلوں سے بچے رہیں۔“

”پہلی پچھلی تو ہو ہی جائے نا، میں پہلی بار دیکھوں گی۔“ اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ ابی جان ٹیلی ویژن پر ٹاک شو دیکھ رہے تھے اور وہ ناظمہ سے باتیں کر رہی تھی۔ تب ہی باہر پھاٹک زور سے بجا۔ سب چونک گئے۔ ان کے کان پر پہلی دستک تھی۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ ابی جان نے کہا تھا مگر اتنی دیر میں ناظمہ کچن کی کھڑکی سے دیکھ بھی آئی۔

”ابی جان وہ برابر کے گھر سے آدی ہے۔“

ناظمہ نے اطلاع دی۔

”اچھا! لغاری صاحب ہوں گے۔“ کرل صاحب سرعت سے اٹھے۔ باہر وہی تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہی تو بن گئے تھے۔ دونوں ہی شطرنج کے ماہر کھلاڑی تھے۔

پہلی شام رات کے دروازے پر دستک، دیتی گرم ہونے لگی۔ دونوں کے قہقہوں نے بھی فضا کو گرم کر دیا تھا۔

اگلے دن واک کے لیے نکلی تو ”مس پلیز“ کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو عمر لغاری بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے وجود میں

ناگواری سی پھیل گئی۔ جانے کیوں اسے یہ شخص اچھا نہیں لگا حالانکہ اس کے بھی کزنز تھے۔ طاہر، آیان، ثوبان اور سب پڑھے لکھے تھے۔ ایسی مذاق کرتے تھے۔ ان میں شائستگی کا عنصر نمایاں تھا۔ مگر یہ شخص.....

”آپ سے دوستی ہو سکتی ہے۔ لگ رہا ہے آپ واک کرنے جا رہی ہیں۔ میں ساتھ دوں۔“ وہ بے تکلفی سے کہتا اس کے سامنے کھڑا ہوا۔

”دراصل میں اتنی مصروف رہتی ہوں کہ مجھے کسی کی دوستی کی ضرورت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں واک کرنے نہیں جا رہی۔ کچھ سوچی ہوئی لکڑیاں لینے جا رہی ہوں۔“

”ساتھ چلتے ہیں۔“ وہ یہ سن کر بھی ساتھ چلنے پر بضد تھا۔

”لگتا ہے آپ نے یہاں کا سارا علاقہ دیکھ لیا ہے۔“ یہ کہتے اس نے قدم آگے بڑھائے۔

”نہیں ابھی تو دیکھ رہا ہوں۔“ دراصل کوئی کمپنی نہیں ہے تو اکیلا بور ہو جاتا ہوں۔ آپ کی کمپنی جوائن کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں مگر آپ.....“ اس نے اس کے محتاط رویے کی جانب اشارہ کیا۔

”یہاں تنہائی اور اکیلے پن میں آپ نے کافی دلچسپی کے سامان کر رکھے ہیں ورنہ اس عمر کی لڑکیاں تو.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا اور آگے کا جملہ اسے سمجھ آ گیا۔

”لڑکیوں، لڑکیوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔“ مریم نے بر جستہ جواب دیا۔

”آپ کے دادا بہت زندہ دل آدمی ہیں۔“

”جی میری پوری فیملی ہی بہت زندہ دل اور شرارتی ہے۔“

”ویسے آپ اس دیرانے میں ایک بوڑھے

انسان کے ساتھ کیسے رہ رہی ہیں؟“ عمر کے منہ سے اچانک نکلا تھا۔

اس کی بات سن کر مریم کے قدم رک گئے۔

”وہ بوڑھے انسان میرے دادا ہیں۔ ان کی خدمت مجھ پر فرض ہے۔ انہوں نے مجھے پالا ہے میرے بچپن کی ذمہ دہ کے بعد۔“ اسے، اس کی بات نے دکھ دیا تھا۔

”اوہو۔“ عمر نے اسے تاسف سے دیکھا۔ ”لگتا ہے آپ کو برا لگ گیا ہے؟“ وہ دھیرے سے ہنسا۔

مریم قریب کی سوچی جھاڑیوں سے ٹہنیاں توڑنے لگی۔ ”میں اپنے ابا کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتی۔“ وہ سلگ کر بولی۔

”سوری۔“ وہ سر جھکا کر مسکرایا۔ ”آپ خاصی مختلف لڑکی ہیں۔“

”ہاں مختلف مزاج۔“ اس نے عمر کو ہنسنے چوتوں سے دیکھا اور مطلوبہ ٹہنیاں اکٹھی کر کے واپس چلنے لگی۔

”دراصل ہم قبائلی لوگ نا ذرا اور طرح کے ہوتے ہیں اور ہماری عورتیں اور طرح کی ہوتی ہیں۔“ مریم قدم روک کر اور سر گھما کر اسے دیکھنے لگی جس کی گردن پر کلف لگ گیا تھا اپنے قبیلے کے فخر کا۔

”لیکن جس ماحول سے آپ آئے ہیں جس ماحول میں آپ نے تعلیم حاصل کی ہے اس لحاظ سے تو آپ کو اس نظام کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“ اس نے جیسے سے ترغیب دلائی تھی۔

”نہیں۔“ عمر نے سینے پر ہاتھ باندھ کر اسے دیکھا اور گویا ہوا۔ ”ہمارے قبیلے کے رسم و رواج اور اقدار جوں کے توں ہیں۔ اسے ہمارے آباؤ اجداد نے بدلا ہے اور نہ ہمارے آج کے سرداروں نے

اس نظام کو بدلنا ہے۔“

مریم کے وجود میں غصے کی ایک لہر سرائیت

کر گئی۔ سرداری قبائلی نظام اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ قدرت اگر اسے موع دیتی تو ضرور ان کے خلاف کام کرتی مگر بھلا ہو ثوبان کا جس نے ہمیشہ اس معاملے میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ کتنا فخر تھا اس کے لہجے میں، ہونہ..... اس لیے یہ شخص مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”ایسی تعلیم کا کیا فائدہ جو نظام کو نہیں بدل سکے“ شعور کو نہ جگا سکے، تبدیلی نہ لاسکے، ایسا تو ایسے ہی جیسے.....“ وہ بولتے بولتے اچانک رک سی گئی۔

”ارے ارے اتنی جذباتیت ٹھیک نہیں۔“ عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ کے خاندان کی عورتیں آج بھی اُن پڑھ اور جاہلی ہیں۔“ وہ کہاں چپ رہتی تھی۔

”ہاں مگر..... بے حد سمجھدار۔“ عمر نے پھر سے اکر کر جواب دیا اور وہ سلگ اٹھی۔

”ہاں یہ سمجھداری ہے کہ اپنے عقل و شعور کو استعمال نہ کریں اپنی آزادی رائے کو رہن رکھو ا دیں۔

اپنے حقوق کا استعمال نہ کریں۔“ وہ ہنسنے بولی۔

”وہ اتنا پڑھ کر کیا کریں گی؟ ان کے لیے قرآن کی تعلیم بہتر رہتی ہے۔“ عمر لغاری کے لہجے میں کوکتے اعتماد سے مریم کو گھمن سی آنے لگی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کلچ کی جانب چلنے لگی۔

”ارے ارے سنیں تو.....“ عمر لغاری پیچھے بھاگا۔

”کیا فائدہ تھا ایسے بے حس غاصب لیروں سے ملنے کا جو خود غرضی کی انتہا کر دیں۔ اس نے دل میں سوچا۔

”کیا ہم یہاں مل کر کل میرے لیے جاسکتے ہیں؟“ اس کی بات سن کر وہ کانچ کے آگے رکی اور گھوم کر

غصے سے بولی۔

”نو..... نیور..... میں ابی جان کو لمحہ بھر کے لیے

تہا نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کی طبیعت..... اس کی آنکھوں میں شوق اور دلچسپی دیکھ کر وہ چپ سی ہو گئی۔ اس کی کینہ تو زنگاہوں نے اسے کراہیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

”اٹکل سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ عمر نے اندر آنے کا بہانہ گھڑا۔

”نہیں سردی بہت ہے اس وقت وہ بستر میں ہوتے ہیں۔“ اس نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”ٹھیک ہے کل صبح ملاقات کر لوں گا۔“ وہ اسے پر شوق نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

مریم بھاٹک کھول کر اندر داخل ہوئی اور پلٹ کر بھاٹک بند کر کے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نگاہ کی بے باکی نے اس کے اندر آگ بھڑکا دی۔ وہ وڈیرہ تھا، مستقبل کا سردار تھا، نسل در نسل چلنے والا جاگیردار۔ اس سے کچھ بھی کہنا عیب تھا اور وہ لفظوں سے نہیں روپیے سے بتا دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کے لیے کوئی مٹی نہیں رکھتا۔

وہ پٹلی اور مضبوط قد تھوڑوں سے آگے آگے چلتی ہوئی سیٹھیاں چڑھی، گلاس ڈور کھولا اور پروتار انداز سے اندر داخل ہو گئی۔ عمر لغاری حدنگاہ تک اسے دیکھتا رہا۔

یہ وقار یہ انداز یہ مصومیت ہی تو اس کا آئیڈیل تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر بھاٹک سے ٹیک لگا کر مسکرایا اور سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔

”تم میری ہو۔“ وہ آنکھیں بند کر کے مسکرایا اور میں عمر لغاری ہوں، جس کے ہاتھ میں دنیا ہے اور دنیا کی ہر چیز اس کی ہے۔ اس کی ٹانگی میں بند۔ وہ بڑے یقین سے مسکرایا اور اعتماد سے آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆

وہ اکثر اب اس کے راستے میں آنے لگا، کبھی والد کے ساتھ تو کبھی والدہ کے ساتھ، گھر بھی آنے

لگا۔ مریم اس سے گریزاں ہی رہتی تھی۔ ادھر ادھر ہو جاتی۔ ناظمہ کے ساتھ کچن میں مصروف ہو جاتی اور اگر بچوں کو پڑھا رہی ہوتی تو ان کے جانے تک پڑھاتی ہی رہتی۔

اس کے گرد پرندوں اور بچوں کی مصحوم دنیا تھی جو بے ریا محبت کرتے تھے بے لوث چاہتیں دیتے تھے۔

”عمر لغاری تمہیں کیا لگتا ہے؟“ اس روز لڈو کھیلے ہوئے ابی جان نے مریم سے اچانک پوچھا۔

”اپنی باری چلیں ابی جان اٹلے سیدھے سوال مت پوچھیں۔ دیکھیں آپ کی کوٹ پٹ رہی ہے۔“ وہ مکمل کھیل کی طرف متوجہ تھی۔

”مجھے تو خاندانی اور سلجھے ہوئے لوگ لگتے ہیں۔ خاصی جائیداد ہے ان کی۔ لغاری تیار ہا تھا۔“ کرمل صاحب کا سوال ہنوز سوال تھا۔

”ابی جان ہمیں کسی کی جائیداد سے کیا لینا اور یہ سب چیزیں انسان کو کیا دیتی ہیں؟ خود آپ کے پاس کتنی جائیداد ہے؟“ اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

”میرے خیال میں تم عمر لغاری کے ساتھ خوش رہ سکتی ہو۔ اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ مریم سر اٹھا کر نہیں دیکھنے لگی۔

وہ سر جھکا کر باری لے رہے تھے۔ ”لو جی“ کھیل ہی ختم ہو گیا۔

”جانتے ہیں آپ یہ جاگیر دار قسم کے لوگ کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ ایسا سوچے گا بھی مت۔ جہاں مجھے خوش رہنا ہے میں رہ لوں گی۔ آپ تو میری بالکل پروا مت کریں۔“ مریم کو غصہ آ گیا تھا ان کی بات پر۔

ابی جان سے اس سوچ کی توقع نہیں تھی مگر رات اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے رمان سے سوچا کہ شاید

وہ حق بجانب ہیں۔ وہ پچیس سال کی ہو رہی تھی اور ابی جان تو دور کی بات اس کی مگنی بھی کہیں نہیں ہوئی تھی۔ ابی جان ہی اس کے خیر خواہ تھے اس کے لیے رشتہ تلاش کرنے کہاں تک جا سکتے تھے؟

مگر..... دیر سے وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک ناپسندیدہ ہستی کے ساتھ زندگی گزارا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ یہاں ان مقامی لوگوں کے گاز کے لیے نیک مقصد کے لیے اس زلیبت کو رکھ کر دیا جائے۔

بے شک ہم لوگ انہوں سے ماپوس ہو چکے ہیں مگر میں کنویں میں چھلانگ نہیں لگا سکتی۔

☆.....☆

صبح وہ چپ چپ سی تھی خاموشی سے ناشتا ہوانہ لپی ویشن آن تھا اور نہ ریلو کا مدہم مدہم شور تھا۔ کھلی کے طور پر مریم جلد ہی لان میں نکل آئی۔ دیر سے ہی لمحے اس پر انکشاف ہوا۔ رات بلی بھٹکی لہاری بھی ہوئی تھی۔ موسم بے حد امیر آلود تھا۔ ان میں ٹھنڈک کا احساس نمایاں تھا۔ درختوں کے پتے نئے نئے سفید ذرات ٹھہرے ہوئے تھے اور ایسا موسم اس کی کمزوری تھا۔ وہ دیر سے دیر سے لان میں چلتے ہوئے قدرت کی صنای پر غور کرنے لگی۔

کرمل افتخار احمد ساگر سلگائے کتاب گود میں گئے گا اس وال سے اسے دیکھتے عین سوچ میں گم ہوئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آج بھی اسے ٹوپان کا انتظار تھا۔ غصے سے ان لوگوں کی جنہوں نے اسے مارا دیا تھا اور آج بھی اسے ان کی آہٹ کا انتظار تھا۔ میں..... میں کیا کروں اس کے لیے؟ لغاری ابی جان ہی ہے مگر اس کی ناپسندیدگی.....

”صاحب جی موسم کی پہلی برف باری کا آغاز ہے۔“ ناظمہ نے انہیں کافی کامگ پکڑ لیا اور ان میں آگ ٹھیک کرنے لگی۔

”ہوں..... مریم کو بھی دو۔ کافی ٹھنڈ ہو رہی ہے باہر۔ اسے کپڑا اندر آجائے۔ یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے کتاب کھولی۔

”ہوم ڈاکٹر تو ہے نا۔“ مریم اندر آ کر سن چکی تھی دیر سے سے پیچھے سے ان کے شانوں پر جھک گئی۔ وہ چونکے۔ اپنائیت کی مہک ان کے گرد بچیل گئی۔ دونوں نے ہی اپنی اپنی سوچوں کو جھٹک کر ایک دوسرے کا دھیان کیا۔

”مجھے شطرنج سکھائے تاکہ آپ کو ادھر ادھر نہ دیکھنا پڑے۔“ کرمل افتخار احمد نے چونک کر اسے دیکھا اور ہنس پڑے۔

”اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ مریم نے خفگی کے تاثر سے انہیں دیکھا اور ان کی آنکھوں میں چھپی ہنسی کو دیکھ کر ہنس دی۔ وہ اس کا عندیہ جان گئے تھے۔ اپنی کوئی خواہش منوانے کے لیے وہ یوں ہی بات کرتی تھی۔

”کچھ نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں سردی بہت لگتی ہے آپ کو۔ ٹھنڈ لگ جانے کا خطرہ ہے۔ مجھے آپ ادھر سے ہی وہاں سامنے اس دیوار کے پار برف میں کھیلنے دیکھیے گا۔ میں برف کے بھالو بناؤں گی۔“

وہ کھٹکھٹا کر ہنس دیے اس کی اس مصحوم سی خواہش پر۔ ”یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا لڑکی! فوجی آدمی ہوں اور فوجی کا دل جذبہ اور امنگ ہمیشہ جوان رہتی ہے۔“ کرمل صاحب نے سیدھے ٹھونکا۔

”مگر بوڑھے فوجی کی نہیں۔“ اس نے شطرنج کی بساط بچھاتے ہوئے انہیں چھیڑا تو وہ کھٹکھٹا کر ہنس دیے۔ ماحول کا تناؤ غائب ہو گیا تھا۔ ناظمہ مسکراتے ہوئے کچن میں چلی گئی اور اسی پل واپس آئی تھی۔ باہر بھاٹک زور سے بج رہا تھا اور وہ کچن کی کھڑکی

سے دیکھ چکی تھی۔

”لغاری صاحب آئے ہیں۔“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”لے آؤ انہیں ادھر ہی ان کی بیگم اور بیٹا بھی ساتھ ہیں۔“ ناظمہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

”بہت فارغ رہتے ہیں یہ لوگ۔ کوئی کام ہی نہیں ہے۔“ ناگاری سے کہتے وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

داخلی دروازے سے وہ لوگ اندر آ گئے اور لاؤنج آباد ہو گیا۔

جموئے، نکار، منافق لوگ۔ خود عیش کرتے ہیں اور گھر کی عورتوں کو قید کر کے باندیاں بنا لیتے ہیں۔ ادھر ہی یہ انکشاف ہوا بلکہ خود لغاری صاحب

نے کیا کہ بیگم ان کی دوسری بیوی ہے اور عمران کی پہلی بیوی سے ہے۔ یہ لوگ شہر میں رہتے ہیں۔“

مریم کا مطلق تک کر دیا ہو گیا اور گاؤں میں ان کی قیدی باندیاں غلام زادیاں ان کی توجہ کی سخت رہتی ہیں۔“

”لگتا ہے آپ کو یہ موسم بے حد پسند ہے۔“

وال مرر سے مسلسل باہر دیکھتے ہوئے عمر لغاری نے قریب آ کر اس سے پوچھا۔

”جی۔“ وہ مختصر آہولی۔

”آئیے باہر چلیں پھر۔“ اس کی آنکھیں اندرونی احساس سے چمک رہی تھیں۔

”میرا موڈ نہیں ہے۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”تو آپ موڈی ہیں؟“ وہ اس کے سامنے فلور کشن پر بیٹھ گیا۔

”بہت زیادہ۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

”مگر لڑکیوں کے لیے یہ اچھی بات تو نہیں۔“ اس نے صلاح دی۔

”کیوں؟ کیوں اچھی بات نہیں؟ مرد کچھ بھی کریں اور لڑکیاں اپنا موڈ بھی کر سکتیں؟“ وہ

بھڑک اٹھی تھی۔

”نہیں میرا مطلب ہے کہ لڑکیوں نے ان کے گھر جانا ہوتا ہے نا۔“

اس کے یہ کہنے پر مریم اسے گھور کر رہ گئی۔

بھئی شادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں زنجیر پہن لوں۔ اپنی سوچ اپنا ذہن اپنا دل جذبات رکھو دوں۔“ اس نے سکتے ہوئے لہجے میں تنبیہ

سے کہا۔ ”اور شادی بھی میری سوچ سمجھ کر کروں گی۔“

عمر لغاری جانے کس بات پر سر جھکا کر نفس اور کرٹل افکار احمد پوتی کے تاثرات اچھی طرح پر

سکتے تھے۔ ”مریم! اپنی سی کافی بنا کر لاؤ۔ ناظمہ مت بھوانا۔“

ان کے جانے کے بعد آج ابی جان کچھ خاموش اور چپ سے تھے۔ کہیں کہیں خدشے دل کی زمین

سرا ہمارا کر انہیں ہولانے لگتے تھے۔

نہیں ایسا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ابی جان اس ذہنی سوچ اور خیالات سے واقف ہیں دل کو یقین تھا

مگر صبح ایک انکشاف اس پر ہوا کہ لغاری نے اسے پردہ زور کر کے گئی ہے۔ مریم ان کے بیٹے کو بڑا

بھاگتی گئی۔ آگے کا سفر وہ اس کے ساتھ طے کرنا چاہتا اور یہ سب ابی جان نے خاموشی سے سن لیا تھا۔

اس کا عزم اس کا فخر دم توڑ گیا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ ابی جان کی توجہ کہیں اور تھی۔ وہ جانتے تھے

اس کی پسند کیا ہے اور کیا وہ اس کے مستقبل سے مایوس ہو گئے تھے؟ دھیرے سے ان کے آگے

اٹھ کر وہ لاؤنج سے ہونی گلاس مرر کھول کر باہر آ گئی۔ اس کا اندر رخ سے بھر گیا۔ باہر آ

خوبصورت منظر تھا۔ موسم کی برفاری میں اضافہ تھا۔ سبزی مائل عالیچے پر اب سفید روئی کا کارہ بچھ چکا تھا۔ فضا میں بے حد شہنشاہی۔ وہ دھیرے

ابی جان جانتے ہیں کہ مجھے قبائل، قبیلے سردار، گھیردار اور جاگیردارانہ نظام کتنا برا لگتا ہے پھر

..... پھر مجھی وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ عمر لغاری کو پوزل آیا ہے؟ اس کے رخ بستہ رخساروں پر

..... کیا میں اتنی بوجھ بن گئی ہوں کندھوں کے مجھے اتار بھیجتا چاہتے ہیں؟

”ہاں۔“ دوسرے لمحے اس پر انکشاف ہوا۔ ”ہاں“

..... وجود سے اکتا گئے ہیں اس تنہائی سے اکتا گئے ہیں اس موسم اس سردی اس برفاری سے تھک

..... وہ یادوں کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتے۔ اب اس عمر میں وہ اپنے پیاروں کے درمیان

..... رہنا چاہتے ہیں اور میرے بوجھ کو اتار کر اپنوں میں

..... جانا چاہتے ہیں، اس کے آنسوؤں نے

..... کیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

”تنہائی، محرومی، اکیلا پن اور تنہائی کتنا بڑا دکھ

..... یا اللہ! یا اللہ! میں میں مجھے موت کیوں

..... آجاتی؟“ اس نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا اور پھر

..... ہی لمحے اس نے سر اٹھایا۔ وہ ایک فیصلہ کر

..... لی۔

موسم کی برفاری اگرچہ شروع ہو چکی تھی مگر

..... راستے ابھی بند نہیں ہوئے تھے۔ اسے کسی

..... دل میں چلے جانا چاہیے۔ پڑھے گی، چاب کرے

..... کی اور اپنے اخراجات خود برداشت کرے گی۔

..... کی گزر جائے گی مگر کسی جاگیردار کی ملکیت نہیں

..... کی۔ جس نظام سے اسے نفرت ہے اس نظام کا

..... نہیں بنے گی۔ یہ سب سوچ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

..... رہا ہے تو ایسا ہی سہی اگر ابی جان اسے کچھ کہہ

..... سکتے مگر وہ موت کے تو وہ تو سمجھ سکتی ہے نا۔

..... کہ وہ کلج کے اندر پلٹ آئی۔

☆.....☆

اگلے دو دن غیر معمولی خاموشی کی نذر ہو گئے۔

صرف دو بچے پڑھنے آئے تھے۔ برفاری نے راستے

بند کر دیے تھے۔ اگلے دو دن وہ بھی نہیں آئے۔

برف باری کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ باہر

برف کی سفید براق چادریں چھپی ہوئیں۔ ارد گرد

کے منظروں کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گلاس

وال سے باہر کئی دیر تک دیکھتی وہ مستقبل کے بارے

میں سوچتی، منظروں کی خوبصورتی دل پر محسوس کرتی

تھی اور ادھر کرٹل افکار احمد الگ اپنی سوچوں میں گم

رہتے تھے۔

سوچتے سوچتے اکثر مریم کی آنکھیں بھی نم ہو

جاتیں۔ ”کیا تھا ابی جان کہہ دیجئے یہ انگج ہے، مٹکی

ہو چکی ہے مگر..... مگر.....“

اس روز گھر کے لاؤنج میں لغاری صاحب اپنی

بیگم کے ساتھ براجمان تھے۔ مریم جل کر رہ گئی۔

”یہ کیا جانیں حقوق اور فرائض کی جنگ؟ یہ کیا

جانیں دکھ کا احساس۔ اس عورت کا دکھ یہ کیسے محسوس

کر سکتے ہیں جو گاؤں میں بیٹھان کر بچوں کو پال رہی

ہے اور یہ دوسری بیوی کے ساتھ یہاں رنگ رلیاں

منار رہے ہیں۔ اس منافقت سے اسے گمن آنے

لگی۔ اگر ابی جان نے فیصلہ ان کے حق میں دیا تو وہ

احتجاج کرے گی۔ اپنے حق کے لیے لڑے گی

اور اسی وقت یہ گھر چھوڑ دے گی۔ اس نے اپنے دل

میں محکم فیصلہ کر لیا اور باہر نکل گئی۔

وہ کئی دیر تک برف پر چلتی رہی، ادھر ادھر گھومتی

رہی، واپسی کے رستے میں عمر لغاری سے ٹکراؤ

ہو گیا۔ وہ بھی گلے میں دوڑ بین لٹکاے گھوم رہا تھا۔

”میرے اور آپ کے شوق کتنے ملتے جلتے

ہیں۔“ وہ انتہائی شوق سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی نہیں۔“ اس نے تنبیہ کی سے رخ پھیر لیا۔

”کم سے کم اتنا تو ہے قدرت کی صنای آپ کو

بھی پسند ہے اور مجھے بھی۔“ وہ مسکرایا۔

”خوبصورت موسم سب کو پسند ہوتے ہیں۔“ وہ کہاں کپڑا کرنا جانتی تھی۔

”یہ تو ہے ویسے آپ کو معلوم ہے امی ابو کیوں آئے ہیں؟“ دبی دبی مسکراہٹ لیے سینے پر ہاتھ باندھے سر پر ادنیٰ ٹوپی لیدر کی جیکٹ پہنے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

”جی نہیں۔“ اس کی رکھائی ہنوز برقرار تھی۔
”لگتا ہے آپ کے ابی جان کو آپ پر اعتماد ہے۔“ مسکراتے ہوئے جملہ ادا ہوا تھا۔

”ہاں وہ جانتے ہیں کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔

”اچھا آپ کی رائے میرے بارے میں کیا ہے؟“ عمر چھوٹے ہی اصل بات پر آیا تھا۔

”میں چلوں سردی بہت ہو رہی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے قدم آگے بڑھا دیے جسے وہ اس کی شرم سمجھا تھا۔

”مجھے مشرق کی یہی ادا تو اچھی لگتی ہے۔“ وہ اسے جانا دیکھ کر ہنسا اور گنگنایا۔ ”کچھ بھی نہ کہا اور

کہہ بھی گئے“ مریم نے ایک بار پھر سر گھما کر غصے سے اسے دیکھا اور وہ اس کی چپ کو خاموشی سے تعبیر کر رہا تھا۔

”میں ایسے لوگوں کے بارے میں کوئی رائے نہیں رکھتی جو منافق ہوں۔ جن کا ظاہر اور باطن الگ

الگ ہو، جنہیں انسانی حقوق اور انسانیت کے بارے میں کوئی علم نہ ہو۔ جو زندگی کے راستے میں

آنکھیں بند کر کے چلیں اور جو صرف اپنی خوشیوں کے لیے جیتے ہوں۔“

یہ سب سن کر عمر لغاری کی ہنسی کو بڑیک لگ گیا اور وہ کچھ سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب؟“
”مطلب ان عورتوں سے پوچھیے گا جو آپ کے

گھر میں عزت اور جائیداد کے نام پر بیٹھی ہیں۔ اس

عورت سے پوچھیے گا جو آپ کے نام پر آپ کی

حویلی میں محو انتظار ہے کہ کب اس کا شوہر آئے اور اس پر ترسی ہوئی نگاہ ڈالے۔“ مریم نے ایک اور جملہ اندھیرے میں چلایا۔ عمر لغاری چونک گیا۔ کو کیا

نشانی پر لگا تھا۔
”اور میں ادنیٰ دن ہوں اسی لیے ہمیشہ نمبروں

ہی رہنا چاہتی ہوں۔“ کو یہ ساری باتیں درپردہ ہو رہی تھیں مگر مریم نے اپنا نقطہ نظر بہت اچھی طرح

اس پر واضح کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ رکی نہیں اور

سنائے میں کھڑا سے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ سب کچھ رہا تھا مگر نہ بچنے کی پوزیشن میں تھا۔

”اتنی ذہین اور مجھدار لڑکی! تمہیں میں نے ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے۔“ خود سے وعدہ کرتے کرتے اس نے اپنے گم ہوتے وجود کو دیکھا تھا۔

☆.....☆

اس نے ابی جان سے کچھ نہیں پوچھا۔ جب بات ہوتی تو اپنی رائے بتا دیتی تھی۔ وہ عقل و شعور

رکھتی تھی شاید اسے احساس ہوا کہ ابی جان کچھ خواہتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی آواز بلند تھی۔ انہوں نے ناظر

سے گرم گرم حلوہ بنوایا تھا اور اب اسے آوازیں دے رہے تھے۔

”ہونہہ، ٹگن کی مٹھائی، مٹھائی نہ سہی، حلوہ نہ سہی۔“ وہ دل میں سوچتی، ان کے پاس آ گئی۔

”کھاؤ، کھاؤ“ بچے آؤ آج میں بہت خوش ہوں۔ دیکھو ناظمہ نے کتنا مزے کا حلوہ بنایا ہے۔

خوشی چہرے سے خوب نمایاں تھی۔
”ابی جان مجھے میٹھا پسند نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”میری خاطر کھاؤ۔“ اور وہ انہیں دیکھ کر گئی۔ اسے رونا آ گیا، کو یا لغاری فیملی کو ہاں کر دیا

گئی ہے۔

”آج میں بہت خوش ہوں۔“ ابی جان پھر چپکے۔
 ”اور میری خوشی؟“ یہ کہہ کر وہ ابھی اور باہر نکل گئی۔
 ”فیصلے کا وقت آن پہنچا کیا؟“ اس نے خود سے
 وال کیا اور کمرے میں آکر بستر پر گر کر پھوٹ
 پوٹ کر رو دی۔

”ابی جان! ابی جان! میں آپ کو ہرٹ نہیں کرنا
 ہا ہتی مگر..... مگر میں کیا کروں! میں آپ کے اس
 فیصلے کو قبول نہیں کر سکتی۔ جس نظام سے میں نفرت
 کرتی ہوں اس نظام کا حصہ نہیں بن سکتی۔“ اس نے
 سوچ کر کشن میں منہ چھپالیا۔

نیلی ویٹن پر موسیقی کا کوئی پروگرام چل رہا تھا،
 آواز بلند کر دی گئی تھی اور حلوہ مڑے لے لے کر کھایا
 جانے لگا تھا شاید۔ اس کے آنسوؤں کی رفتار میں
 اضافہ ہو گیا۔

ساری رات وہ سوچتی رہی آئندہ کے لائحہ عمل
 کے بارے میں۔ ظاہر ہے ابی جان اس سے بات
 کرتے تو اس نے فوراً انکار کر کے انہیں دکھ دینا تھا اور
 غصے میں انہوں نے اسے گھر سے نکال دینا تھا۔
 یہاں سے نکلنے سے پہلے اسے کچھ معلومات کرنی
 ہیں، قریب ترین ہو ہاسٹل کے بارے میں۔ اس
 کے بعد کسی جاب کے لیے اپلائی کرنی۔ اس سے
 پہلے اسے برف باری کے رکنے کا انتظار کرنا تھا تاکہ
 راستے صاف ہوتے اور راستہ بننا۔

زادراہ کے لیے اس کے پاس کچھ چھوٹی موٹی
 پہاڑی تھی جس کو وہ ہر وقت پہننے رہتی۔ اگر فوری
 رہائش کا بندوبست نہ ہوا تو کچھ دن کے لیے ناظمہ
 سے پناہ مانگے گی۔

بستر پر بیٹھی، گھٹنوں پر سر رکھے وہ ان ہی سوچوں
 میں گم تھی، نیند غائب تھی، دکھ بے حد اذیت ناک
 تھا۔ اس نے اٹھ کر دھیرے سے درپچوں کے
 درے کھینچ دیے۔

اف..... باہر برف باری بہت تیزی سے
 ہو رہی تھی۔ روٹی کے گالے بارش کی طرح گر رہے
 تھے۔ سارا سبزہ چھپ گیا تھا۔ لان میں بلب کی زرد
 روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں آنکھوں میں ہی
 صبح ہو گئی۔ ٹائم دیکھ کر اس نے فجر کی نماز ادا کی
 قرآن پڑھا۔

دن نکلنے لگا تھا۔ وہ دھیرے سے داخلی دروازہ
 کھول کر باہر نکل آئی۔ دھیرے دھیرے صبح پڑھتی
 وہ ادھر ادھر دیکھتی رہی اور قدرت کی صنائی پر رشک
 کرتی رہی۔

صبح ناشتے کے دوران ناظمہ نے بتایا۔ ”برف
 باری بہت ہوئی ہے راستے بند ہو گئے ہیں۔ میں نے
 شفیق سے کہا تھا کہ جب برف باری زیادہ ہو تو آکر
 راستہ صاف کر جائے۔ آج آئیں گے وہ لوگ۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ مریم خاموشی سے
 ناشتا کرتی رہی پھر اٹھ کر اپنے چوڑوں اور کپڑوں کو
 دیکھنے لگی۔ خرکوش کو شفیق اور سلیم اپنے ساتھ ہی لے
 گئے تھے۔ یہاں ٹھنڈ بہت تھی اور ان کے لیے جگہ بھی
 چاہیے تھی۔

کرنل صاحب اس پر گہری نگاہ ڈال کر اخبار کی
 جانب متوجہ ہو گئے۔ مریم ان سے خفا تھی وہ جانتے
 تھے۔ اسے کچھ دن خفا ہی رہنے دیا جائے تو بہتر
 ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے اس کی بہتری کے لیے ہی
 کر رہے تھے۔ اسے کیا خبر کہ اس کے لیے کیا بہتر
 ہے اور کیا نہیں؟

کچھ دیر بعد شفیق اور سلیم نے اپنی آمد کی اطلاع
 دی۔ وہ راستے کی برف ہٹانے آئے تھے۔ کچھ
 اوزار تھے ان کے پاس۔ وہ اپنے کام میں مگن تھے۔
 ابی جان کو بتا کر وہ ان کے ساتھ باہر نکل گئی۔
 ٹھنڈا، بریفنا سوئم اسے بے حد پسند تھا۔ برف ہٹاتے
 ہٹاتے وہ لوگ خاصی دور نکل گئے۔ راستہ بہت حد

تک صاف ہو گیا تھا۔

”ناظمہ! کھانا اچھا سا بنانا“ میرے مہمان آرہے ہیں۔“ گھر میں قدم رکھتے ہی ابی جان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی اور وہ دھک سے رہ گئی اور وہیں ٹھنڈے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ ٹھنڈک اس کے وجود میں سرایت کرتی رہی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا اسے وہیں بیٹھے بیٹھے؟ بھی بڑی تیز آواز میں پچانک کھلا اور کوئی بے دھڑک اندر آ گیا۔ مریم نے سراٹھا کر دیکھا، دوسرے لمحے وہ دھک سے رہ گئی آنے والا بھی اسے دیکھ کر چونکا کیونکہ اسے بھی امید نہیں تھی کہ یوں وہ اسے سامنے مل جائے گی۔

”تم..... تم آگئے؟ میری قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ اب..... اب..... وہ دیر سے اپنے منجمد وجود کو سمیٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔

آنے والا دیر سے دیر سے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دکھ اذیت اور روحانی تکلیف نے اس کے وجود کا جیسے احاطہ کیا ہوا تھا۔ وہ بے ساختہ پلٹی اور دوسرے لمحے اندر کی جانب بھاگی۔ آنسوؤں نے راستہ دھندلا دیا تھا۔ باہر شور شرابا تھا، ایک ہنگامہ تھا۔ آج اسے اپنی بے وقوفی کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ دکھ قیامت کا تھا جس نے رگ جال کو چھید کر رکھ دیا۔

”بی بی! کھانا لگ گیا ہے۔“ ناظمہ نے آ کر اسے اطلاع دی تھی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے کشن منہ سے ہٹائے بغیر کہا۔ ناظمہ چلی گئی۔

”تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ اس آواز پر وہ چونکی۔ ٹوبان اس کے کمرے میں موجود تھا۔ بے ساختہ اس نے کشن منہ سے ہٹایا۔ کلمے دروازے کی دونوں چوکتوں پر ہاتھ رکھے ٹوبان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”تمہاری خوشیوں میں شریک ہونے آیا ہوں۔“

”میری خوشی؟“ آنکھیں پھر سے اس کی بھیگنے لگیں۔

”ہاں دادا جان کی پسند تو لا جواب ہے۔“ وہ اندر آ گیا۔

”جیسے تمہارے شوق ہیں، تمہیں باقی خاندان ہی اس آسکتا ہے۔“ وہ بے انتہا خوش تھا۔ ”خوب پولٹری فارم کھولنا، چوزوں سے انڈے اور انڈوں سے چوزے بنانا، فارم ہاؤس بنانا تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا اور سنو ڈوچار اسکول بھی بنا ڈالتا۔ بہت پیسہ ہوتا ہے ان لوگوں کے پاس۔“

اس کی باتیں سن کر اس نے سر جھکا لیا۔ آنسو بھل بھل بہنے لگے تھے۔

”میں ابی جان کو لے جانے آیا ہوں۔ یہاں ٹھنڈ بہت ہے، ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ اس کے بستر پر بیٹھ چکا تھا۔

”وہ پوچھ رہے ہیں، نکاح سادگی سے ہوگا یا.....“ یہ کہہ کر جیسے ٹوبان نے انتہائی کردی تھی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ ”نہیں کرنا مجھے کوئی شادی..... میں اپنی زندگی اپنے سہارے گزار سکتی ہوں..... بوجھ نہیں ہوں میں کسی پر..... جاب کروں گی اور ہوٹل میں رہ لوں گی.....“ بازو سے آنکھوں کی دھند صاف کرتے ہوئے وہ بولے گئی۔

ٹوبان ہکا بکا رہ گیا۔ ”ابی جان کا شکریہ کہ انہوں نے مجھے اتنا سہارا دیا۔ اب میں اس قابل ہو گئی ہوں

کہ اپنا بوجھ خود اٹھا لوں۔“ وہ چیخ چیخ کر روئی اور بستر پر گر گئی۔ ”کوئی کسی کا بوجھ ساری عمر نہیں اٹھا سکتا۔“ وہ غڈ حال ہو کر گر گئی۔ بھوک، دکھ درد نے اسے خود سے بے خبر کر دیا۔

ٹوبان آگے بڑھا، ابی جان اور ناظمہ اس کی آواز سن کر بھاگے چلے آئے تھے۔ ٹوبان نے اسے سیدھا کیا تو اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ بے ہوش ہو چکی ہے اس کا وجود بے حد سرد ہو رہا تھا۔

”ابی جان.....!“ وہ خوف سے پلٹا۔ ناظمہ اور ابی جان بھاگے ہوئے آئے تھے۔

”یہ بے ہوش ہے، اسے جوتا سنگھاس جی!“ ناظمہ نے سادگی سے کہا تو ٹوبان جھٹ بولا۔

”پاگل ہو..... سیریا کا دورہ ہے کیا؟“ اس نے اسے سیدھا کیا۔

ناظمہ نے کبل ڈالا اور پھر ٹوبان اس کی ہتھیلیاں ملنے لگا۔ مریم کا چہرہ بالکل ستا ہوا تھا، تورم آنکھیں، جھیکے ہوئے گال، جیسے کرل صاحب کو کچھ ہونے لگا۔

”کس نے کہا تھا مذاق میں اس حد تک جاؤ؟“ کرل صاحب نے غصہ کیا۔

”سوری ابی جان.....! میں نے سوچا کہ.....“ وہ واقعی شرمندہ ہو گیا تھا۔

”بکو مت..... یہاں ڈاکٹر بھی نہیں ملیں گے۔ سارے راستے بند ہیں۔“ کرل صاحب نے ٹھکر سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

”مریم.....! مریم.....! یہ تو تم نے بھی آتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔“ وہ نیم جان ہو رہی تھی۔

”آپ ہیں ناہوم ڈاکٹر۔“ یہ کہہ کر وہ دھیرے سے ہٹا۔

ابی جان نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ناک بند کی

آنکھیں کھل گئیں۔

ناظمہ نے منہ پر پانی چھڑکا اور مریم نے عالم بے خبری سے انہیں دیکھا اور سب یاد آنے پر وہ رونے لگی اور اٹھ بیٹھی۔

”کیسی طبیعت ہے؟“

مریم نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں دھند لہرا رہی تھی۔ دونوں دادا پوتا ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر قہقہے دیے۔

”بہت برے ہو تم ٹوبان! کیا کہا ہے میری بیٹی سے؟“ کرل صاحب نے ہلکی سی چپت پوتے کو لگائی۔

”کچھ نہیں ابی جان.....! خوشی کی مبارک باد دی تھی، خوشخبری دی کہ میں تمہاری خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے آ گیا ہوں۔ جواب میں یہ.....“ ٹوبان نے ہلکی دانتوں میں دبا کر شرارتی سے لہجے میں کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا۔ ابی جان بھی ہنس رہے تھے۔

”اور کچھ ہونے والے شوہر کے بارے میں.....“ ٹوبان نے قہقہہ لگایا۔

”بکواس بن کر دو.....“ وہ چیخ پڑی۔ ”نہیں کرنا مجھے شادی..... کیا تم نہیں جانتے میرے خیالات؟

کیا اتنی بوجھ ہوں میں کہ کسی بھی لوبخو کے ساتھ چل پڑوں؟“ اس نے دوپٹے سے چہرہ ملا۔

”للو بچو کہاں صاحب حیثیت، صاحب اقدار صاحب خاندان ہیں۔“ ٹوبان نے اپنے کالر جھاڑے۔ ناظمہ نے ہنستے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھے۔

”ٹوبان.....! ٹوبان.....! وہ جنگلی بلی کی طرح کشن لے کر اس پر چھٹی۔“ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے.....

دفع ہو جاؤ..... کوئی نہیں ہے میرا..... کوئی نہیں..... ایک بار پھر سے وہ خود کو کمر بکھ کر رو دی۔

کرل اختار احمد نے ٹوبان کو آنکھوں ہی

ایک طویل زمانے سے اجوائن کو چائے کی پتی کی طرح ابال کر پیٹ کے امراض کے علاج کے لیے اجوائن جراثیم کے نموکوم کرتی ہے۔ نظام ہضم کو بہتر بناتی ہے اور برا کائش اور نزل زکام کی علامتوں کو گھٹاتی ہے۔ اجوائن کو چل کر کرکٹ جانے اور چھل جانے والی جگہوں پر بھی لگایا جاتا ہے اور اس صورت میں یہ اسٹیپلک کا کام دیتی ہے۔ اجوائن عام نزلہ زکام کے لیے بہت زیادہ موثر ہے۔ یہ مفید اثرات جڑی طور پر اجوائن کے تیل میں بھی پائے جاتے ہیں جسے 1900 کے اوائل میں ایک عام اور مقبول جراثیم کش دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور اب بھی اس کو کھانسی اور زکام کی متعدد تجارتی دواؤں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

”ہیں.....؟“ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔
”ہاں۔“ یہ کہہ کر اس نے برف کا کولہ اس کے منہ پر دے مارا اور اپنا بدلہ لے لیا تھا۔
”ٹوبان کے بچے.....!“ مریم نے برف کا کولہ بنا کر اس پر پھینکا۔

”من کے بچے۔“ وہ زور سے بولا اور مریم بٹس ہو گئی۔ اسی وقت پھانگ کھلا اور ابی جان کی سنگت میں کچھ لوگ اندر آ گئے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مریم شرماکر اندر بھاگی اور ہنستے ہوئے ٹوبان ابی جان کی جانب بڑھ گیا۔

کچھ ہی دیر میں دونوں کا نکاح ہو گیا۔ ڈیڑھ سو اطمینان ابی جان کے چہرے پر پھیل گیا۔ یہ ساتیں ان کے لیے ڈیڑھ سو خوشیاں لائی تھیں اور اب زندگی حقیقت میں گنگنا رہی تھی۔

ضرورت ہے اور میں..... مریم نے سر گھما کر اس کے صبح چہرے کو دیکھا۔ کل اور آج میں کتنا فرق تھا! کتنا فریش تھا یہ چہرہ! طمانیت تھی اس روپ میں۔

”میں تم لوگوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ میں ماما پاپا کے کسی فیصلے کو قبول نہیں کر سکتا۔ عینی کو بہت سارے لوگ مل جائیں گی مگر مجھے تم نہیں مل سکتیں، تمہیں میں نہیں مل سکتا۔“ ٹوبان جذب دل سے کہہ رہا تھا اور وہ ہونٹوں کی طرح یہ انکشاف سن رہی تھی۔

”تو کرسی بھی مل ہی جائے گی۔ جب تک میں تمہارے ساتھ کام کروں گا۔ بچوں کو ٹیوشن دوں گا اور اس علاقے کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہم کام کریں گے۔“ ٹوبان کے یہ کہنے پر مریم نے سر جھکا لیا۔ زندگی خود بخود دھربان ہو گئی تھی۔

”دیے تم نے تو اپنے چوزوں، کبوتر، طوطے، بلیوں، خرکوش میں بڑ کر مجھے بھلا دیا تھا۔“ ٹوبان نے پر شکوہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”نہیں.....“ بے ساختہ مریم نے سر اٹھایا۔ ”یہ سب تو دھیان بنانے کے بہانے تھے ورنہ.....“ وہ یکدم کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”کیا.....!“ وہ برف پر پھسلا۔ ”ذرا پھر سے کہنا۔“ مریم کھلکھلا کر ہنس دی اور برف کا کولہ بنا کر اس کے منہ پر دے مارا۔

”ارے..... ارے.....“ وہ بھی ہنس دیا۔ موسم کی خوبصورتی کے ساتھ اس کی دیوانگی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

”اس سے پہلے کہ وقت ہر چائی اور لوگ ظالم سانج بن جائیں، ابی جان شام کو ہمارا نکاح کر رہے ہیں اور اسی مقصد کے لیے وہ ابھی ناظمہ کے ساتھ گئے ہیں، اس کا انتظام کرنے اور وہ نکاح خواں کے ساتھ کوہان کا بھی انتظام کر لیں گے۔“

دی اپنی قسمت پر اپنے صبر پر۔
”یا اللہ.....!“ ٹوبان سر قدام کر کارپٹ پر گر گیا۔ ناظمہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی۔
”بولو منظور ہے؟“

جواب میں وہ ہنسیکے چہرے سے مسکادی۔ قوس و قزح کے ساتوں رنگ اس کے چہرے پر تھے۔ ایک دم سے موسم بدل گیا تھا۔
”آئی ایم سوری ابی جان! میں نے غصے میں نجانے کیا کچھ کہہ دیا؟“ مریم نے شرماتے ہوئے کہا تھا۔

”بچے..... ایہ محبت ہے۔ یہ حق ہوتا ہے۔ یہ اپنائیت، بھرا احساس تھا۔ ویسے ایک گلہ ہے، تم نے اپنے ابی جان کو اتنا برا کیسے سمجھ لیا تھا؟“ کرگل صاحب نے محبت سے پوچھا۔

”نہیں..... ابی جان.....! دراصل وہ..... میں.....“ اس بات پر وہ بوکھلا گئی۔ ٹوبان ہنس رہا تھا۔ مریم نے کشن اسے گھنچ مارا۔ ”کتنا تنگ کیا ہے مجھے.....“

کالج کی فضا ایک دم سے بارش و بہار ہو گئی تھی۔
☆ ☆

”مگر کیسے ٹوبان؟ تائی امی اور تائی ابو کیسے مان گئے؟“ کالج کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے مریم نے پوچھا۔

”تم آم کھاؤ، بیڑ کیوں گن رہی ہو؟“ ٹوبان نے محبت سے کہا۔
”اگر بعد میں گتنا پڑ گئے تو؟“ مریم نے فکر سے پوچھا۔

”نہیں اب کبھی نہیں گنگوگی۔“ ٹوبان نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔
”میں نے بہت سوچ سمجھ کر اتنے دنوں میں یہ فیصلہ کیا ہے۔ ابی جان کو، ان کے بڑھاپے کو میری

آنکھوں میں سرزنش کی۔ ٹوبان نے ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ وہ گریہ وزاری کرتی رہی۔
”مریم.....!“ ابی جان نے اسے اٹھایا۔

”کوئی نہیں ہے میرا..... کوئی نہیں.....“ رورو کر اس کی سیاہ آنکھیں سوچ گئی تھیں چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ٹوبان دور کھڑا بیٹھنے پر ہاتھ باندھ اسے دیکھتا رہا۔
”ہم..... ہم سب تمہارے ہیں مریم.....!“ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔“ کرگل صاحب نے اسے پیار سے چمکا رہا۔

”ہاں! ہم سب دیکھو میں اتنی دور سے گھر والوں کی مخالفت مول لے کر یہاں اس دامن کوہ میں آ گیا ہوں۔ گھر داماد بننے کے لیے۔“ وہ روئے گئی۔ سوں..... سوں کی وجہ سے اس کی بات ٹھیک سے سن نہیں سکی۔

ٹوبان اس کے قریب آیا۔ ”اے لڑکی.....!“ اس نے اس کا سر اونچا کیا۔ ”کیا کہا ہے میں نے؟ میں نے سب گھر والوں سے بغاوت کر دی ہے۔ میں ابی جان کے بغیر نہیں رہ سکتا اور میں کوئی گناہ نہیں کر رہا“ منالوں گا انہیں۔“ ٹوبان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ سکتے میں رہ گئی۔

”اب بھی یقین نہیں آیا کیا؟“ یہ کہہ کر اس نے اس کے سر پر چٹ لگائی۔ مریم نے بے یقینی سے ابی جان کو دیکھا انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں! اسے ہم گھر داماد رکھ لیتے ہیں۔“ اندرونی خوشی سے ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔
”اور..... اور..... وہ.....“ وہ عمر کا خیال آتے ہی ہٹا لئی۔

”وہ..... اے کوئی مارو..... وہ بہرہ دیا اس قابل ہے کہ مریم کی شادی اس سے کی جاسکے؟“ یہ کہہ کر کرگل صاحب نے محبت سے اسے گلے لگایا۔
”بی..... جان.....!“ وہ ایک بار پھر رو